اسلام
غلط فہمیوں کا ازالہ

محمد زین العابدین منصوری

اسلام

غلط فہمیوں اور اعتراضات کا ازالہ

محمد زین العابدین منصوری

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

ترتیب

پیش لفظ ۵

۱- طلاق — عورت پر ظلم؟ ۹

▫ تمہید ▫ حقیقت اور پروپیگنڈا ▫ طلاق یعنی آزادی ▫ دو انتہاؤں کے درمیان معتدل راہ
▫ حقِ طلاق دہی میں عدم مساوات ▫ مطلقہ عورت سے ہمدردی ▫ خودکار نظامِ اصلاح

۲- تعدد ازدواج — (Polygymy) عورت پر ظلم؟ ۱۵

▫ تمہید ▫ تعددِ ازدواج کی اجازت ▫ مختلف حالات ▫ غیر اسلامی متبادل
▫ اسلامی متبادل ▫ تعدد ازدواج اور 'مسلم آبادی میں اضافہ'

۳- پردہ — عورت پر ظلم؟ ۲۱

▫ تمہید ▫ حیا، پردہ، اور عفت مآبی ▫ پردہ-اسلام کا موقف ▫ پردہ کی اسلامی حکمت
▫ ترقی کی راہ میں پردہ حائل؟ ▫ ترقی میں بے پردہ خواتین کا کردار...آئینہ بولتا ہے
▫ چہرے کا پردہ ▫ پردہ کی مخالفت کا ایک اہم سبب ▫ مغربی دنیا کی گواہی

۴- جہاد — قتل و غارت گری، دہشت گردی؟ ۲۹

▫ تمہید ▫ جہاد کا مطلب ▫ جہاد کی مختصر تعریف ▫ جہاد.....دہشت گردی؟

۵- کافر — مذہبی گالی؟ ۳۲

▫ تمہید ▫ 'کافر' کے معانی ▫ اصطلاحی معنی ▫ گالی نہیں.....محض شناختی لفظ
▫ قرآن کا موقف ▫ کافروں کے ساتھ سلوک

۶- جبری تبدیلیِ مذہب ۳۶

▫ تمہید ▫ اسلام کا اصولی موقف ▫ مسلم دورِ حکومت میں تبدیلیِ مذہب
▫ تبدیلیِ مذہب...مسلم موقف ▫ دعوت.....نہ کہ جبر
▫ لَو جہاد.....شرمناک اعتراض ▫ جدید تہذیب
▫ اسلام کی خوبی اور کشش.....یا 'جبر'؟

۷- اسلامی سزائیں — بے رحمی و بربریت؟ ۴۱

▫ تمہید ▫ چوری کی سزا ▫ زنا کی سزا ▫ زنا کے غیر ثابت کردہ الزام کی سزا

▫ قتلِ ناحق کی سزا ▫ قاتل کو قتل کی سزا نہ دیے جانے کی دلیل
۸- مسلم پرسنل لا — علاحدگی پسندی؟ ۴۷
▫ تمہید ▫ ہندوستان کے آئین میں یکساں سول کوڈ کا بیان ▫ ملک کے اتحاد و سالمیت کا سوال
▫ مسلمانوں کا اصرار
۹- وحدتِ ادیان کیوں نہیں؟ ۵۰
▫ تمہید ▫ مذہب ▫ مذہب کیا ہے؟ ▫ کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
▫ اسلام کا موقف ▫ 'مذاہب' کے بنیادی عقائد میں تضاد
▫ مذاہب میں عدمِ مساوات...ایک حقیقت ▫ نتیجہ
▫ دینِ حق کی تلاش ▫ مذہب کو کیسا ہونا چاہیے؟ ▫ اسلام کا امتیاز ▫ عملی تصدیق
۱۰- ذبیحہ و قربانی — تشدد، بے رحمی، ہِنسا؟ ۵۹
▫ تمہید ▫ ہندوستانی روایات میں ذبیحہ، قربانی اور گوشت خوری ▫ اسلام کا موقف
▫ مسلم موقف ▫ مسلمانوں کی 'متشدد فطرت' (؟)
۱۱- کعبہ — بت پرستی کی علامت؟ ۶۴
▫ تمہید ▫ کعبہ اور حجرِ اسود ▫ کعبہ اور حجرِ اسود کی تاریخ
۱۲- اذان — اور شہنشاہِ اکبر ۶۷
۱۳- صرف اسلام ہی سچا مذہب کیوں؟ ۶۹
▫ تمہید ▫ 'مذاہب' کی حقیقت ▫ اسلام کا موقف ▫ مذہب کا بانی (Founder)
▫ مذہب کا تخاطب.....تمام انسانوں سے ▫ مذہب زندگی کے ہر لمحے کے لیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اسلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تشکیل میں انسانی فطرت کو بگاڑنے والے اور شخصی رجحانات یا قومی وگروہی ضروریات ومفادات کی خاطر مذہب میں تبدیلی وترمیم یا حذف و اضافہ کرنے والے اسباب وعناصر کا کوئی رول نہیں ہے۔ یہ اس اللہ کا دین ہے، جو انسان اور فطرتِ انسانی کا خالق ہے۔ یہ خصوصیت اسلام کو انسانوں کی اصل فطرت کے عین مطابق ایک 'دین' بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دائرۂ اسلام سے باہر رہ گئے جن انسانوں کی فطرت اپنی اصل پر برقرار ہے اور اسے شیطان اور نفس کے خارجی و داخلی اسباب نے مسخ نہیں کر دیا ہے ان کے سامنے جب اسلام اپنی حقیقی اور شفاف صورت میں آتا ہے تو ان کے دماغ ودل میں اترتا چلا جاتا ہے اور جنھیں حق کی طلب ہوتی ہے وہ اسے قبول بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن اسلام پر اطمینان اور دینِ حق کی قبولیت کی رفتار بہت سست اور مقدار بہت کم ہے۔ کیوں کہ اسلام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں اللہ کے ان بندوں اور اسلام کے درمیان حائل ہیں۔ ان پردوں کو ہٹا دیا جائے تو اسلام کی دعوت کو یقیناً ایک سازگار فضا اور ہموار زمین ملے گی اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے نیز ہدایتِ حق سے محروم بندگانِ خدا اسلام سے استفادہ کرنے کے موقف میں آنے لگیں گے۔ یہی اللہ کو مطلوب ہے، اسلام کو مطلوب ہے اور بہ تقاضائے ایمان ہم مسلمانوں کا مطلوب بھی یہی ہونا چاہیے۔

بحمد اللہ گزشتہ کچھ برسوں سے مسلمانانِ ہند کارِ دعوت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ دینی جماعتوں، تنظیموں، دانش گاہوں، علمی، تعلیمی وصحافتی اداروں اور علماء نیز افراد کو دعوت کی اہمیت و ضرورت کا ادراک ہونے لگا ہے۔ کارِ دعوت سے اب تک کی غفلت یا کمی وکوتاہی کے نقصانات کا

احساس بیدار ہوا ہے اور ان نقصانات کے ازالہ کا داعیہ پیدا ہو چلا ہے۔ دوسری طرف اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے، کسی نہ کسی بہانے اس پر اعتراضات کرنے، اسے بدنام کرنے اور اس کی کردار کشی اور اس کی تصویر بگاڑنے کا کام بھی (کارِ دعوت کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ) ہو رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے برادرانِ وطن میں کئی طرح کے ردِعمل پیدا کیے ہیں۔ کچھ لوگ اسلام سے خوف زدہ و دہشت زدہ (Islamophobic) ہو رہے ہیں تو کچھ لوگ متنفر۔ لیکن اکثر لوگوں میں اسلام کے بارے میں تجسس پیدا ہو رہا ہے۔ گویا دعوت کے لیے زمین زرخیز ہے، بس اس کی تیاری، اس میں اسلام کی تخم ریزی اور آبیاری کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگ لٹریچر کے ذریعہ، انٹرنیٹ سے اور دعوتی جلسوں میں شریک ہو کر یا شخصی گفتگو کے ذریعہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جو روزمرہ زندگی میں مسلمانوں سے میل ملاپ (Interaction) کے دوران ان سے اسلام کے بارے میں سوالات کرتے، اعتراض کرتے اور اشکال کا اظہار کرتے ہیں۔

غلط فہمیوں کے ازالے اور اعتراضات کا جواب دینے کے لیے عموماً تین اسلوب اختیار کیے جاتے ہیں:

اول: برادرانِ وطن (مدعوئین) سے مناظرانہ گفتگو اور 'اینٹ کا جواب پتھر سے' دے کر ان کو شکست دینے اور اُن کا منہ بند کر دینے کا اسلوب۔ یہ دعوتِ اسلام کا نہ صرف غیر مفید اسلوب ہے، بلکہ دعوت کے عظیم اور مقدس کاز کے لیے نقصان دہ (Counter-productive) ہے۔ اس کتاب میں اس اسلوب سے اجتناب کیا گیا ہے، سوائے چند ایسے مقامات کے جہاں معترض بات کو جوابی لہجہ میں بآسانی سمجھ سکے اور اسلامی موقف اس پر جلد واضح ہو جائے، یا اپنے اعتراض کے غلط و الزامی ہونے کا ادراک اس کے لیے آسان ہو جائے۔

دوم: خود مدعوئین کی مذہبی کتابوں سے دعوت کے حق میں دلیلیں پیش کرنا۔ یہ اسلوب 'پوری طرح غلط یا غیر مفید' نہیں ہے۔ بعض اوقات اس کے دعوتی فائدے بھی ہوتے ہیں۔ تاہم یہ احتیاط ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ مدعوئین پر 'تم بھی سچ، ہم بھی سچ' کا تاثر نہ پڑنے پائے۔ مزید یہ کہ جب اُن دھرم گرنتھوں کا مکمل شکل میں خدائی کتاب ہونا ثابت شدہ اور یقینی نہیں ہے تو انھیں تقدس اور معتبریت کا ایسا مقام نہیں ملنا چاہیے جو دعوتِ اسلامی کی تاثیر (Impact) کو زائل

کر دے اور مدعو کو یہ کہنے کی دلیل مل جائے کہ سارے دھرم گرنتھ سچے، اور خدائی ہیں لہٰذا سارے مذاہب 'حق' ہیں۔ اس کتاب میں اس اسلوب سے بھی اجتناب کیا گیا ہے، سوائے گوشت خوری، ذبیحہ اور قربانی کے ضمن میں ایک مقام کے۔ لیکن وہاں بھی تقریبِ فہم کے لیے ایسا کیا گیا ہے، نہ کہ بطورِ دلیلِ قاطع کے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ برادرانِ وطن کو اُن کے جن دھرم گرنتھوں سے دعوتِ اسلامی کے حق میں دلیلیں دی جاتی ہیں، ان سے خود اُن کا عملی تعلق نہایت کم، حتیٰ کہ بیش تر معاملات میں بالکل صِفر ہوتا ہے۔ ایک موہوم سے عقیدہ و جذبہ سے زیادہ، اُن لوگوں کا کوئی حقیقی عملی رشتہ ان گرنتھوں سے نہیں ہوتا (سوائے نا قابلِ ذکر استثناء کے)۔ اکثر نے ان کا مطالعہ تو کجا، انھیں پوری زندگی میں دیکھا بھی نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی مجہول کتب کے مندرجات کا، اسلام کے حق میں بطورِ دلیل پیش کیا جانا تاثیر کے اعتبار سے ایک کارِ عبث ہی ہوتا ہے۔ کچھ استثنا ہو سکتے ہیں، ورنہ اکثر مدعوئین ان مندرجات کے حوالوں سے اثر پذیری میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔

قرآن میں اہلِ کتاب کو 'کلمۂ سواء' (توحید کے عقیدۂ مشترک اور ترکِ شرک) کی طرف دعوت دینے کی ہدایت دی گئی ہے (16:125)۔ ہندوستان میں وید میں توحید کی واضح تعلیم اور شرک کی تردید موجود ہے، تاہم وید کے تذکرے اور حوالوں سے اس حکمت کے پیشِ نظر اجتناب کیا جانا چاہیے کہ تجربات و مشاہدات نے بالعموم یہ ثابت کیا ہے کہ اس اسلوبِ دعوت سے مدعو 'وحدتِ ادیان' کی دلیل نکال لیتا ہے۔ یعنی سارے دھرم یکساں طور پر درست، حق، اور قابلِ قبول ہیں۔ اسے 'سرو دھرم سمبھاؤ' کا ایک پرکشش نام بھی دے دیا گیا ہے۔

سوم: اسلام کو صرف اس کے اپنے دلائل و براہین اور اس کے اپنے مآخذ (Sources) سے پیش کیا جائے اور خود مدعو کے مشاہدات نیز اخلاقی، روحانی و معاشرتی تجربات کے حوالوں سے خود اس کی عقل، فہم، ضمیر، اور وجدان کو اپیل کیا جائے۔ اس کی فطرتِ سلیمہ کو آواز دی جائے، تاکہ اس کے دماغ و دل میں اسلام کے اتر جانے کا راستہ ہموار ہو سکے۔ اس کتاب میں غالب طور پر یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

بعض اوقات، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انفرادی گفتگو کے دوران، وطنی بھائیوں کو اسلام سے متعلق کسی سوال یا اشکال کا تشفی بخش جواب نہیں مل پاتا، اعتراض اطمینان بخش حد تک رفع نہیں

ہو پاتا، یا حکمتِ دعوت ملحوظ نہیں رہ پاتی۔ سائل یا معترض اس نقص کو متعلقہ مسلمان کی کم علمی، بے علمی یا بے حکمتی پر نہیں، بلکہ خود اسلام کی خامی، نقص اور کم زوری پر محمول کر بیٹھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جب کہ اسلام ایک بڑا سوالیہ نشان اور تجسس کا موضوع بن چکا ہے، ہم مسلمانوں کی یہ خامی دعوتِ اسلام کے کاز میں، اور ساتھ ہی مسلمانانِ ہند کے لیے بھی نقصان دہ واقع ہو رہی ہے۔ اس کیفیت کا ازالہ وقت کی بہت بڑی ضرورت اور ہم مسلمانوں کے ترجیحی فریضہ کا درجہ رکھتا ہے۔

غلط فہمیوں اور اعتراضات کے ازالے کے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے بحمداللہ خاصی کوششیں کی جاری ہیں۔ ان کوششوں میں ایک ادنیٰ سے اضافے کے طور پر برادرانِ وطن کے استفادے کے لیے ہندی میں ایک کتاب لکھی گئی تھی۔ اب اس میں کچھ ضروری تبدیلی کے ساتھ بہ زبان اردو یہ کتاب ان برادرانِ ملت کے استفادے کے لیے لکھی گئی ہے، جو دعوت کا جذبہ اور شوق رکھتے ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اس مقصد میں اس کتاب کو مفید اور خاکسار راقم کے لیے توشۂ آخرت بنائے، جناب محمد اقبال ملاّ صاحب (سکریٹری شعبۂ دعوت جماعتِ اسلامی ہند) کو بھی بہترین اجر سے نوازے، جن کی تحریک اور اصرار پر یہ خدمت انجام دی گئی اور جناب عبدالرب کریمی صاحب (معاون، شعبۂ دعوت) کو بھی، جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں بہت دلچسپی اور سرگرمی سے کام کیا۔ آمین!

محمد زین العابدین منصوری
نئی دہلی، اپریل ۲۰۱۴ء

باب:۱

طلاق: عورت پر ظلم؟

''اسلام میں عورت کو طلاق دینے کی گنجائش ہے۔ یہ ذاتی طور پر عورت پر اور سماجی طور سے طبقۂ نسواں سے ایک ظلم ہے۔ یہ صنفی مساوات (Gender Equality) کے بھی خلاف ہے۔ کیوں کہ شوہر تو طلاق دے سکتا ہے، لیکن بیوی کو طلاق دینے کا حق حاصل نہیں۔''

تمہید

یہ غلط فہمیاں کچھ تو ناواقفیت کی وجہ سے ہیں، کچھ غلط ذرائع سے حاصل شدہ غلط معلومات کی وجہ سے پیدا ہوتی، اور کچھ سوچ سمجھ کر اسلام پر اعتراض کرنے کی غرض سے سماج میں پھیلا دی گئی ہیں۔ ان اعتراضات کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسلام میں ہی طلاق کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ صرف مسلمان ہی اپنی بیویوں کو طلاق دیتے ہیں۔ شوہر بیوی میں تعلقات خواہ کتنے ہی خراب ہو گئے ہوں، ان میں علاحدگی نہیں ہونی چاہیے۔ طلاق، لازماً عورت پر ظلم ہے اور مسلم سماج میں طلاق عام ہے۔

ہندوستانی سماج کی مذہبی روایات میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اتنی غیر فطری بات تھی کہ سیکولر نظامِ قانون کو دھرم میں مداخلت کر کے قانوناً طلاق کی گنجائش پیدا کرنی پڑی اور ہندو سماج کو اس خارجی مداخلت کو برداشت بھی کرنا پڑا۔ کیوں کہ طلاق کی گنجائش نہ ہونے سے بڑے بڑے خانگی، سماجی، اخلاقی اور قانونی مسائل پیدا ہوتے رہے تھے، جنھیں حل کرنا نہ حکومت کے بس میں تھا، نہ سماج کے، نہ خاندان اور زوجین کے۔ طلاق کے تعلق سے جس مقام پر ہندوستانی سماج صدیوں تک مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بعد بیسویں صدی کے وسط میں پہنچ سکا، اس سے بدرجہا بہتر اور مطلوبہ مقام پر اسلام نے چودہ صدی پہلے ہی مسلم سماج کو پہنچا دیا تھا۔ ازدواجی زندگی کچھ ناگزیر وجوہ سے اگر ایسی تلخ ہو جائے کہ شوہر بیوی اور خاندان تباہی کے نرغے میں

آ جائے تو ایسی کیفیت کا مداوا تلاش کرنے میں انسانی عقل و تجربے کو صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ لیکن انسانوں کا خالق، ان کا فطرت شناس اور ان پر رحیم و کریم خدا صدیوں کے تجربے کا محتاج نہیں ہے۔ اس نے 'دینِ اسلام' انسانوں کو عطا کیا اور جو لوگ اس دین کے پیروکار ہوئے انھیں ایسی تعلیمات، ایسا عقیدہ اور ایسے ضابطے، اصول اور قوانین دیے جن میں انسانوں کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ طلاق کا قانون انسانوں کا نہیں، انسانوں کے خالق اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے۔ لہٰذا ناموافق حالات میں الجھ گئے شوہر اور بیوی دونوں کے لیے اس میں خیر ہی خیر ہے، جب تک کہ حقِ طلاق اور طریقۂ طلاق کا جائز اور بہتر استعمال کیا جاتا رہے۔

حقیقت اور پروپیگنڈا

جائزوں سے یہ حقیقت سامنے آتی رہتی ہے کہ طلاق کی شرح مسلمانوں کے بالمقابل غیر مسلم سماج میں کافی زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں سب سے کم طلاق کے واقعات کی اصل وجہ اُس 'اسلام' سے ان کی وابستگی ہے جس نے انھیں یقین دلا دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک 'جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔' لہٰذا چند نادان یا جاہل لوگوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت، ازدواجی زندگی میں اگر شدید تلخیاں پیدا ہو چکی ہوں، نباہ دشوار ہو رہا ہو تب بھی اپنے خدا کی ناراضی سے ڈرتے ہوئے طلاق دینے سے حتی الامکان گریز کرتی ہے۔ یہ صرف پروپیگنڈا ہے جو برادرانِ وطن کو یہ مغالطہ اور تاثر دیتا ہے کہ گویا مسلم سماج میں اسلام نے طلاق کو بالکل عام کر کے رکھ دیا ہے۔

طلاق - یعنی 'آزادی'

طلاق (عربی لفظ) جن تین حروف 'ط ل ق' کے مادّہ سے بنا ہے، ان سے بننے والے الفاظ 'آزاد' رہنے، آزاد ہو جانے، کا مفہوم رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر فتح مکہ کے وقت جب کفارِ مکہ کسی بڑی مصیبت (انتقام اور قتل) کا تصور کر کے لرز رہے تھے، تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فانتم الطلقاء۔ یعنی آج کے دن تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم لوگ آزاد ہو۔'' (طلقاء = آزاد، جن پر کسی پابندی یا شرط کی جکڑن نہیں)۔ لہٰذا طلاق کے ذریعے مرد اور عورت ایک دوسرے سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ان کے ایک دوسرے کے ذریعے

فرائض وواجبات اور حقوق واختیارات کی کوئی پابندی نہیں رہ جاتی۔ تلخی، جھگڑے لڑائی، مار پیٹ اور شر، بدسکونی اور بے عزتی کی کیفیات سے نجات مل جاتی ہے۔ اب دونوں کو موقع ہے — اور بالخصوص عورت کے لیے یہ موقع ایک نعمت سے کم نہیں ہے — کہ آگے کی زندگی اپنی پسند سے گزارنے کا فیصلہ اور اقدام کریں۔ یا نئے سرے سے نئی ازدواجی زندگی شروع کریں۔

عورت کو اسلامی شریعت نے یہ سہولت عطا کر رکھی ہے کہ اگر اس کے بچے بھی ہیں تو (اپنی مستقبل کی زندگی کے منصوبے وارادے کی مناسبت سے) بچوں کو شوہر کے سپرد کر کے، ان کی پرورش کی ذمہ داری سے بھی آزاد ہو جائے، خصوصاً جب کہ وہ دوسری شادی کرنی چاہے۔ یا بچوں کو (ان کی) کم عمری میں اپنے ساتھ رکھنا چاہے تو ان کے بڑے ہو جانے پر ان کے باپ پر ان کی ساری ذمہ داریاں ڈال کر ان کی کفالت کی ذمہ داری سے آزاد ہو جائے۔ کون ذی ہوش آدمی اسلام کی ان تعلیمات اور شریعت کے ان ضوابط وقوانین کو 'عورت پر ظلم' کہے گا جن میں عورت کی سہولت، آزادی اور حق خود اختیاری کا پورا سامان کیا گیا ہے۔

دو انتہاؤں کے درمیان معتدل راہ

ہمارے سامنے مغربی اور مشرقی - دو تہذیبوں کی نظیر ہے۔ مشرقی تہذیب میں خصوصاً بھارتیہ سنسکرتی کی۔ مغرب میں ذرا ذرا سی بات پر، حتی کہ شوہر یا بیوی کے رات کو خراٹے لینے پر بھی، ایک فرد دوسرے سے (شوہر بیوی سے یا بیوی شوہر سے) طلاق لے لیتا/ لیتی ہے۔ کورٹ میں گئے، مطالبۂ طلاق کی دلیلوں سے جج مطمئن ہوا اور ازدواج کا مقدس رشتہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔ طلاق نہ ہوئی، بچوں کا کھیل ہو گیا۔ بھارت میں دوسری انتہا: عورت کی، مائیکے سے ڈولی اٹھی تو بس سسرال سے ارتھی ہی اٹھے گی۔ اس سے کوئی غرض نہیں کہ اگر نا چاقی اور بدتعلقی کی وجہ سے دونوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہو، سکونِ قلب غارت ہو گیا ہو، اگر اولاد ہے تو تباہ ہو رہی ہو، خودکشی ہو رہی ہو۔ ساتھ چھڑانے کے لیے قتل کیا، کرایا یا آگ لگا کر عورت کو جلا کر مار ڈالا جا رہا ہو اور پولیس کیس بن جائے تو کہا جا رہا ہو کہ کچن میں کھانا بناتے وقت کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی... وغیرہ وغیرہ۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جب زوجین ایک دوسرے سے علاحدگی کا ہی فیصلہ کر چکے ہوں تب بھی دونوں کے خاندان کے عقل مند لوگ آپس میں بیٹھ کر مصالحت اور اصلاح کی تمام ممکن

تدابیر اور کوششیں کر ڈالیں۔ پھر بھی مصالحت نہ ہو سکے تو شوہر ایک بار طلاق دے۔ انتظار کرے۔ ہوسکتا ہے، بعد میں مصالحت ہو جائے۔ ایسا نہ ہو تو اگلا حیض آنے کے بعد دوسری بار طلاق دے۔ دونوں ایک ساتھ ایک ہی مکان میں رہیں، تاکہ رجوع (مصالحت) کا موقع رہے۔ پھر بھی مصالحت نہ ہو تو اگلے حیض کے بعد تیسری اور آخری طلاق دی جائے، جو نافذ ہو جائے گی۔ دونوں ایک دوسرے پر حرام ہو جائیں گے۔ لیکن تین ماہ دس دن تک عورت اسی مکان میں رہے گی تاکہ (سابقہ) شوہر سے کوئی حمل ہو تو ظاہر ہو جائے۔ وہ اسی شخص کا بچہ مانا جائے اور آگے چل کر عورت پر بدچلنی کا الزام نہ آنے پائے۔ کون بے عقل شخص ہوگا جو ایسے طلاق کو 'عورت پر ظلم' کہے گا؟

حقِ طلاق دہی میں عدمِ مساوات

اسلام میں اس بات کی گنجائش ہے کہ شوہر ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ اصلاح صورتِ حال میں بیوی کو طلاق دے سکتا ہے اور عورت ایک متعینہ ضابطے کے مطابق قانونی طریقے سے شوہر سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ طریقہ 'خلع' کہلاتا ہے اور اِسے شریعت نے تفصیل کے ساتھ مقرر اور متعین کر دیا ہے۔ البتہ عورت کو خود طلاق دینے کا اختیار نہ دینے میں اسلام نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ عورت فطری طور پر مرد سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں زیادہ جذباتی ہو جاتی ہے، لہٰذا اس بات کا امکان زیادہ ہوتا ہے کہ کسی وقتی مسئلہ میں طیش میں آ کر اور جذباتیت سے مغلوب ہو کر شوہر کو طلاق دے دے۔ یہ محض قیاس و گمان ہی نہیں ہے، بلکہ مغربی معاشرے نے اسے صحیح بھی ثابت کر دیا ہے۔ اپنی پسند کا چینل دیکھنے پر اصرار کرنے والی بیوی نے شوہر سے ریموٹ کنٹرول نہ ملنے پر طلاق لے لی۔ شوہر کے خراٹے کی وجہ سے نیند نہ آنے کی وجہ سے پریشان بیوی نے طلاق لے لی۔ آشنا کے ساتھ تفریح پر اعتراض کیے جانے پر بیوی نے جذباتی ہو کر طلاق لے لی۔ شوہر کی کسی بات سے بہت زیادہ تکلیف یا اس کی کسی بات سے بے عزتی محسوس کر کے یا کسی گھریلو جھگڑے میں جذباتی ہو کر بہت دور تک یا بہت آگے کی سوچے بغیر (شوہر کے ذریعہ طلاق دینے کے مقابلے میں) بیوی کے ذریعہ طلاق دے دینا زیادہ ممکن ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام عورت کو طلاق لینے کا حق تو دیتا ہے، طلاق دینے کا اختیار نہیں دیتا۔ اس میں دراصل عورت کی ہی خیر خواہی کا پہلو پوشیدہ ہے۔

مطلقہ عورت سے ہمدردی

طلاق پر اعتراض کرنے کا ایک مثبت سبب بھی ہے کہ لوگ طلاق شدہ عورت سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ اس بارے میں اسلام کے خاندانی اور معاشرتی نظام کو جانتے نہیں، اس لیے سمجھتے ہیں کہ ایسی عورت کا کوئی پرسانِ حال، حامی و مددگار نہیں ہے، اس لیے طلاق اس پر سراسر ظلم و استحصال اور ناانصافی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اسلام نے اسے بے سہارا اور قابلِ رحم بنا کر نہیں چھوڑا، بلکہ اس کے لیے مختلف سطحوں پر کئی انتظامات کیے ہیں۔ مثلاً:

۱- نکاح کے وقت ہی اسلام شوہر سے بیوی کو مہر دلاتا ہے۔ مہر کی رقم پر اس کے شوہر کا بھی، یا سسرالی رشتے داروں کا حق نہیں ہوتا۔ وہ خود اس کی مالک و مختار ہوتی ہے۔ مشکل اور نامساعد حالات میں (مثلاً: طلاق کے بعد) وہ رقم اس کا سہارا بنتی ہے۔

۲- شادی کے موقع پر یا بعد کے ایام میں شوہر جو بھی رقم، زیور، سامان، جائداد وغیرہ بیوی کو دیتا ہے، طلاق ہونے پر اس سے واپس نہیں لے سکتا۔

۳- طلاق کے بعد عورت واپس اپنے مائیکے کی ذمہ داری میں چلی جاتی ہے۔ وہاں والدین یا بھائیوں پر اس کے گزر اوقات، نان ونفقہ اور رہائشی انتظام کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ وہ بے سہارا نہیں رہتی۔

۴- مطلقہ عورت اگر دوسرا نکاح کرنا چاہے تو مائیکہ والوں کو نہ صرف یہ کہ اسے روکنے، نکاحِ ثانی میں رخنہ ڈالنے کا اختیار نہیں ہوتا، بلکہ لازمی طور پر ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کی پسند کا رشتہ تلاش کر کے شادی کرائیں اور اس کا نیا گھر بسا دیں۔ (نہ کہ وہ ابھاگن بن کر میکے میں پوری زندگی گزارے)۔

۵- عورت کا اس کے مرحوم والدین کے ترکے میں شریعت نے مقرر حصہ رکھا ہے۔ والدین کی چھوڑی ہوئی دولت، مکان، جائداد، کاروبار، زمین وغیرہ میں اس کا حصہ قرآن نے تفصیل کے ساتھ مقرر کر دیا ہے۔ (۴:۱۱، ۱۲، ۱۷۶) اس تعین کو قرآن نے حدود اللہ کہا ہے جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ہمیشہ کے لیے جہنم میں جلنے کی وعید سنائی گئی ہے (۴:۱۴)۔ اسی طرح کچھ خاص حالات و کیفیات میں بھائیوں اور کچھ دیگر رشتہ داروں کی دولت میں بھی اسے حصہ دیا گیا ہے۔ طلاق شدہ عورت نکاح ثانی کرے یا نہ کرے، دونوں صورتوں

میں وہ حصہ پانے کی مستحق ہے۔

۶- عام طور پر کوئی کنوارا شخص کسی طلاق شدہ عورت سے شادی نہیں کرتا۔ فطرتِ انسانی کے خالق اللہ نے اسی بات کا خیال رکھتے ہوئے، شریعت میں تعدّد ازدواج کی گنجائش رکھی ہے، تاکہ طلاق شدہ عورتوں کو لوگ دوسری (یا مخصوص حالات میں تیسری اور چوتھی) بیوی بنا کر ان کا سہارا بن جائیں۔ اسے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہو جائے۔

خودکار نظامِ اصلاح (Sefl-reformative System)

اتنے انتظامات کے سائے میں طلاق عورت کے لیے ظلم نہیں بن پاتا۔ ہاں مسلم معاشرے میں نادانی اور جہالت کے سبب پائی جانے والی کچھ خامیوں کی بنا پر کچھ معاملوں میں مطلقہ عورتوں کو کچھ مشکلیں ضرور پیش آتی ہیں۔ لیکن خدا کا خوف، اسلامی اخلاق، خاندان اور معاشرے کا دباؤ وغیرہ کچھ ایسے عوامل ہیں جو ایسی عورت کو سہارا فراہم کراتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم معاشرے میں قرآن، حدیث، شریعت اور اخلاقیات کے حوالے سے تعلیم اور تذکیر ہمیشہ جاری رہتی ہے، اصلاحِ معاشرہ کی کوشش مسلسل ہوتی رہتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر جہالت اور کم علمی کی سطح مسلسل نیچے گرتی رہتی ہے اور مطلقہ عورت کی وہ مبینہ بدحالی مسلم معاشرے میں بننے نہیں پاتی جس کا بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ یا جسے ایک مسئلہ بنا کر وقتاً فوقتاً اسلام پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ مسلم معاشرے پر طلاق کے ظلم ولعنت ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اسلام کے خلاف نفرت کا ماحول تیار کیا جاتا ہے یا سیدھے سادے برادرانِ وطن لاعلمی کی وجہ سے طلاق کے ضمن میں اسلام اور مسلم معاشرہ سے بدظن ہو جاتے ہیں۔

ꕥ

باب:۲

تعددِ ازدواج: عورت پر ظلم؟

(Polygymy)

''اسلام میں تعدد ازدواج رائج ہے۔ یہ عورت کے استحصال کا ذریعہ اور اس کے ساتھ ظلم و بدسلوکی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے تناظر میں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمان کئی کئی بیویاں رکھ کر زیادہ بچے پیدا کر کے اپنی آبادی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس طرح کچھ عرصہ میں وہ اکثریتی طبقہ بن کر ملک کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتے ہیں۔''

تمہید

انسانی تاریخ کی ہر قوم اور علاقے میں انبیاء اور رسولوں کے ذریعے مختلف ادوار طے کرتے ہوئے تقریباً ۱۴۵۰ رسال قبل جب اسلام اپنی قطعی اور آخری شکل میں آیا تو اس دور میں تعدد ازدواج مختلف صورتوں میں دنیا کے تقریباً ہر معاشرے اور تہذیب میں رائج تھا۔ مثلاً ہندو معاشرے کی اہم، عظیم، محترم مذہبی شخصیات اور عظیم ہستیوں کی متعدد بیویوں اور رانیوں کا تذکرہ مذہبی کتب میں ملتا ہے۔ عرب معاشرے میں بھی، جہاں اللہ کے کلام کے نزول کے ساتھ اسلام کی تجدید ہوئی، بیویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر و متعین نہیں تھی۔ تاریخ کے ایسے مرحلے میں اسلام آیا تو اس نے زیادہ سے زیادہ چار کی تعداد متعین کر دی۔ اسلام نے تعدد ازدواج کی روایت شروع نہیں کی، بلکہ بیویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کا تعین کر دیا اور اسے مشروط بھی کر دیا۔

تعدد ازدواج کی اجازت

اسلام نے یہ اجازت دی ہے کہ انفرادی یا سماجی سطح پر اگر ایسی صورتِ حال پیش آ جائے کہ ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی مرد، عورت، خاندان اور معاشرے کے لیے مفید اور ضروری ہو تو مرد حالات کے مطابق دو، تین یا زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کر سکتا ہے۔ یہ اجازت اس شرط کے ساتھ ہے کہ تمام بیویوں کے ساتھ مکمل انصاف و مساوات کا معاملہ کیا جائے۔ اگر اس کا

احتمال نہ ہو یا آدمی میں اس کی استطاعت نہ ہو تو شریعت کا حکم ہے کہ بس ایک ہی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار دی جائے۔

دیکھنا چاہیے کہ اگرچہ عام حالات میں مسلم معاشرے سمیت کسی بھی معاشرہ میں تعدد ازدواج عموماً رائج نہیں ہے، پھر بھی وہ کون سے مخصوص حالات ہیں جن میں تعدد ازدواج کی ضرورت پیش آسکتی ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں اور اسے ممنوع قرار دینے کے نقصانات کیا ہیں؟ اسے ناجائز اور غیر قانونی قرار دینے اور اس کا راستہ بند کر دینے سے مرد، عورت، اولاد، خاندان، معاشرہ اور نظام پر کیا برے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ کیسے شدید مسائل پیدا ہوتے ہیں؟

مختلف حالات

۱- بیوی کسی وجہ سے تولید کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ وہ بانجھ ہوسکتی ہے یا اسے کوئی خاص مرض لاحق ہوسکتا ہے۔ شوہر والد بننے اور افزائشِ نسل کی خواہش کا گلا گھونٹنے پر خود کو قادر نہیں پاتا۔

۲- بیوی کسی ایسے جنسی مرض (Venerel Disease) میں مبتلا ہو جائے کہ ماہرینِ امراضِ نسواں شوہر کو اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے سے منع کر دیں اور ایسی صورتِ حال میں شوہر خود پر قابو پانے میں فطری طور پر ناکام ہو جائے۔

۳- کسی بیوہ عورت کا کوئی سہارا نہ ہو۔ اسے ذہنی، جذباتی، خاندانی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی مسائل کا سامنا ہو۔ اس کے سامنے جنسی ضروریات کی تکمیل کا کوئی راستہ نہ رہ گیا ہو۔ وہ خود کو تشنہ اور غیر محفوظ محسوس کرتی ہو۔ اسے جنسی، معاشی اور معاشرتی استحصال، مسائل اور دشواریوں کا اندیشہ یا خطرہ ہو۔ کوئی بھی کنوارا شخص اس سے شادی کرنے کو تیار نہ ہو (یہ ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے) نیز مائیکے/سسرال میں اس بیوہ کا کوئی سہارا نہ ہو۔

۴- کسی بیوہ کے چھوٹے بچے ہوں اور ان معصوموں کی بیچارگی اور اپنی بیوگی کا دوہرا بوجھ اٹھانا اس کے لیے مشکل اور ناقابلِ برداشت ہو۔ مائیکہ، سسرال، رشتے دار، معاشرہ کوئی بھی اس کی مدد کے لیے آگے نہ آرہا ہو۔

۵- کسی بڑی جنگ میں مرد اتنی بڑی تعداد میں مارے جائیں کہ غیر شادی شدہ یا بیوہ عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہو جائے۔

۶- مرد میں جنسی قوت اور جنسی خواہش بہت زیادہ ہو اور وہ ضبطِ نفس اور خود پر قابو پانے میں ناکام ہو جائے۔ ایک بیوی سے اس کی ضروریات پوری نہ ہوں اور وہ مذہبی حدود، اخلاق یا معاشرتی روایات اور عام ضابطۂ اخلاق کا پاس ولحاظ رکھنا دشوار پاتا ہو۔

دیکھنا چاہیے کہ مندرجہ بالا حالات میں 'غیر اسلام' اور 'اسلام' کے پاس کیا متبادل ہیں۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہر متعلقہ متبادل عورت پر ظلم ہے یا احسان۔ ساتھ ہی یہ بات بھی کہ عورت کے ساتھ خود شوہر، ازدواجی زندگی، خاندان اور معاشرتی نظام کے لیے کون سا متبادل نقصان دہ ہے اور کون سا مفید؟

غیر اسلامی متبادل

مندرجہ بالا حالات میں غیر اسلامی متبادل (یک زوجی Monogymy) کے اثرات ونتائج درج ذیل ہیں:

۱- شوہر، بیوی، خاندان، سماج اور قانون سے پوشیدہ رکھ کر دوسری شادی کر لے۔ وہ سب کو دھوکہ دیتا رہے۔ دوسری بیوی پر ہونے والے اپنے وقت اور دولت کے خرچ کو چھپانے کے لیے پہلی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں سے ہمیشہ جھوٹ بولتا رہے۔ اگر یہ سب نہ کر سکتا ہو تو بے چاری پہلی بے قصور بیوی سے چھٹکارا پانے کا کوئی غیر اخلاقی یا مجرمانہ راستہ اختیار کر لے۔

۲- کسی مستقل مرض کی بنا پر بیوی کے ساتھ جسمانی تعلق نہ بنایا جا سکتا ہو تو چوری چھپے غیر عورتوں سے غیر اخلاقی تعلق استوار کیے جائیں۔ ایسی عورتوں کی تعداد کتنی بھی ہو سکتی ہے۔ بدکاری وزنا کے اس دائرے کی کوئی حد نہیں۔ کتنی عورتوں کی ناموس تار تار ہوتی ہے، کوئی فکر نہیں۔ کتنی جنسی زیادتیاں ہوتی ہیں، زنا بالرضا (Consensual Sex) کی دلیل پر قانون اور سماج کی جانب سے کوئی گرفت نہیں۔ مرد بیوی تو ایک ہی رکھے، لیکن داشتائیں (رکھیلیں Concubines) چاہے جتنی رکھے، کوئی حرج نہیں۔ شہر شہر قحبہ خانے قائم ہوں، جہاں عورتوں کی عصمت خریدی اور بیچی جاتی ہو، ٹھیک ہے۔ شوہر جہاں چاہے منہ مارے، معاشرے میں جتنی چاہے گندگی پھیلائے، جتنی بھی دوشیزاؤں اور عورتوں کی عصمت کے ساتھ کھلواڑ کرے، سب درست ہے۔ لیکن جائز اور قانونی طریقہ سے دوسری بیوی گھر

لے آئے تو عورت پر ظلم کا مجرم وملزم قرار پائے۔ یا پہلی (بے قصور) بیوی سے کسی اور ناجائز ترکیب سے پہلے نجات حاصل کر کے دوسری شادی کرے۔

۳- نکاح ثانی کے اختیار سے محروم عورت کے لیے جل کر مرجانے، یا جلا کر ماردیے جانے کا راستہ ہندوستانی سماج میں موجود ہے، یا پھر چونکہ مائیکے کے خاندان میں عموماً بیوہ (بیٹی، بہن) کی واپسی کا رواج نہیں ہے اس لیے ایسا بھی ہو رہا ہے کہ ہزاروں بیوائیں سماج کی نگاہوں کے سامنے کچھ 'دھرم نگریوں' میں پوجا استھلوں کے علاقوں، سڑکوں اور گلیوں میں بے سہارا ماری ماری پھرتی ہیں۔ اگر وہ یہ بھی نہ کرسکیں اور مائیکے میں ہی واپس جانا ان کی مجبوری بن جائے تو چوڑیاں توڑ کر مانگ سونی کر کے، زیب وزینت سے محروم سفید ساڑی پہن کر ابھاگن بن کر نندوں اور بھاوجوں کے طعنے، کوسنے سہہ کر بے بسی، لاچاری کی حالت میں خادمہ کی طرح رہنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔ سماج نہ تو انھیں دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے اور نہ کسی مرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ایک بیوی کو رکھتے ہوئے ایک بے سہارا اور مصیبت کی ماری عورت کو بیوی بنا کر اس کے تمام مسائل کو حل کردے (اور قانون بھی اس کی اجازت نہیں دیتا)۔ اس لیے معاشرہ یا تو اس بیوہ کو دھکے کھانے اور مختلف قسم کی تکالیف وذلت جھیلنے کے لیے چھوڑ دے گا یا کچھ ترس آ ہی گیا تو بیواؤں کے کسی سینٹر میں داخل کردے گا۔ بیواؤں کے کچھ سینٹرس ان کی لاچاری اور مجبوری کا فائدہ اٹھا کر انھیں جسم فروشی پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے معاملات سامنے آتے رہتے ہیں کہ کچھ وِدھوا آشرم (بیواؤں کے مراکز) بے چاری بیواؤں کے ذریعہ جسم فروشی کا منصوبہ بند کاروبار چلاتے ہیں۔

۴- یہاں بھی وہی متبادل ہیں، جو حالت ۳ میں بتائے گئے۔ یا زیادہ سے زیادہ، یتیموں کو یتیم خانوں کے حوالے کردینے کا انتظام، جہاں اگر اخلاقی قدریں مضبوط نہ ہوں تو یتیموں پر مظالم اور ان کا ہمہ جہت استحصال ہوا کرتا ہے۔

۵- حالت ۵ کے تحت تاریخ گواہ ہے کہ ایسے حالات میں عورتیں اور بیوائیں عوامی استعمال کی شے (Public Property) بن جانے پر مجبور ہوئیں۔ ان کے جنسی استحصال کے علاوہ سماج اور قانون کے سامنے کوئی اور متبادل نہ رہا۔

(۶) وہی متبادل جو حالت ۲ میں مذکور ہے۔

اسلامی متبادل

مندرجہ بالا حالات میں اسلام نے تعدد ازدواج کا متبادل دیا۔ اس میں عورت کا جنسی تحفظ یقینی ہے۔ پھر اس کے جذباتی، ذہنی، نفسیاتی، جسمانی، مادّی، معاشی اور معاشرتی تحفظ کو یقینی بنایا گیا ہے۔ یہ اس پر اسلام کا احسان ہے۔ اسے ظلم، استحصال اور ذلت وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا فہم مردہ ہو چکا ہو۔ اس سے آگے تعدد ازدواج کا یہ اسلامی نظم خود شوہر کے اخلاق و اطوار، اور شرافت و پاکیزگی کی حفاظت کے لیے ایک مبارک طریقہ ہے۔ بیواؤں سے لے کر یتیموں کے مسائل تک اس کے ذریعہ خود حل ہوتے رہتے ہیں اور سماج کا اخلاقی تانا بانا بکھرنے نہیں پاتا۔

کسی بڑی جنگ میں جب بڑی تعداد میں مرد مارے جائیں اور عورتیں کثیر تعداد میں بیوہ ہو جائیں تو غیر اسلامی تہذیب کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی عورتوں میں سے اکثریت کے لیے جسم فروشی کے اڈے، عصمت فروشی کی دکانیں اور بازار بنا دینے کے سوا سماج اور اجتماعی نظام کے پاس اور کوئی متبادل نہیں رہ جاتا۔ اسلام ایسی غیر معمولی ایمرجنسی کی حالت میں تعددِ ازدواج کا متبادل کھلا رکھ کر بے سہارا بیواؤں کو معاشرتی، معاشی اور ذہنی اذیت اور جنسی استحصال سے بچا لیتا ہے۔

تعدد ازدواج اور آبادی میں اضافہ

کسی بھی معاشرے کی طرح مسلم معاشرے کا بھی عمومی عمل اور حقیقی صورتِ حال اس بات کی تردید کرتی ہے کہ ہر مسلمان چار شادیاں کرتا ہے۔ اس سے بڑی حماقت کی بات اور کیا ہوگی کہ مسلم معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے چار گنا زیادہ ہے اور ہر شخص چار چار بیویوں کے نان ونفقہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا اہل ہے۔

یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ مسلم اور غیر مسلم بچوں کی آبادی بڑھنے کا تناسب 4:1 کا ہے۔ آبادیات (Demography) کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ گزشتہ ۶۵ رسالوں میں مسلم آبادی ملک کی کل آبادی کا ۱۰-۱۳ فیصد رہی ہے۔ ادھر گزشتہ ۳۰-۳۵ رسالوں سے کچھ مخصوص ذہنیت والے ماہرینِ سماجیات بار بار یہ بات پیش کر کے ملک کے غیر مسلم عوام کو خوف زدہ کرتے رہے ہیں کہ آئندہ بیس، تیس سالوں میں مسلم آبادی غیر مسلموں کے برابر ہو جائے گی (اور مسلمان پھر سے اقتدار حاصل کر لیں گے)۔

کوئی بھی سمجھ دار شخص یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ ۲۵ رمسلمان مرد ۱۰۰ رعورتوں سے شادی کر کے اوسطاً ۶۲۵ بچے پیدا کریں گے۔ ''اس لیے ہم پانچ ہمارے پچیس'' کا الزام لغو اور مضحکہ خیز ہے۔ ایک مسلمان مرد نے چار عورتوں سے شادی کی ہو ایسی کوئی مثال مسلم سماج میں نہیں مل سکتی۔ یہ بڑی گھٹیا بات ہے کہ ہندوستان کے سارے مسلمانوں سے ۲۵، ۲۵ بچے ہونے کے ایک ناممکن تصور کی بنا پر اعداد و شمار گھڑے جائیں اور ان خیالی اعداد کے ذریعہ ملک کے عوام کو مسلم اکثریت کا خوف دلایا جائے۔

ꕥ

باب:۳

پردہ: عورت پر ستم؟

''فطرت میں پھیلا ہوا حسن انسان کی فرحت اور تفریح کا ذریعہ ہے۔ یہ بات نسوانی حسن پر بھی عائد ہوتی ہے۔ لیکن اسلام فطرت کے اس دل کش اور بے مثل حسن کو کپڑوں میں لپیٹ کر انسانی فطرت کے ساتھ ناانصافی کر کے اور نسوانی حسن کے اظہار پر پہرہ بٹھا کر تہذیب وتمدن اور خود عورت پر ظلم کرتا ہے۔ ساتھ ہی مساوات مرد وزن کا مخالف بن کر حقوق نسواں کی پامالی کرتا ہے اور تعمیر وترقی میں عورتوں کو حصہ لینے سے روکتا ہے؟''

تمہید

چھ سات سال کی عمر تک پہنچ کر بچوں میں کسی بیرونی عوامل (جیسے والدین کے ذریعہ نصیحت، ترغیب اور تربیت وغیرہ) کے بغیر ہی اپنے جسم کے مخصوص اعضاء کو چھپانے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل وہ فطری حیا ہے جسے عورت اور مرد میں پیدا کرنے اور جلا بخشنے کا کام خود فطرت کے ذریعہ (اسلامی عقیدے کے مطابق خود انسان کے خالق اللہ کے ذریعہ) کیا جاتا ہے۔ یہ جبلت انسانوں کے علاوہ اور کسی جان دار میں نہیں ہوتی ہے۔ شرم وحیا کا یہ مضبوط اور فطری نظام انسان کے لیے خاص طور پر، صرف اس لیے ہے کہ اس کے (عورت اور مرد کے) پاس عصمت کی ایک ایسی بیش قیمت دولت ہے جو دوسرے کسی جان دار کے پاس نہیں ہوتی۔ اس دولت کی حفاظت کے لیے انسان کو حیا کی صفت دی گئی ہے۔ کچھ وجوہ سے، جن میں خاص وجہ (قرآن ۲۴:۲۱، ۷:۲۰ کے مطابق) شیطانی وسوسہ ہے، یہ صفت جس قدر کم زور، مسخ اور آلودہ ہوتی ہے، انسان کی، بالخصوص عورت کی عصمت اسی قدر تباہی و بربادی سے دوچار ہونے لگتی ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ بھی ہے۔

حیا، پردہ اور عفت مآبی

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ عورتوں میں مردوں کے بالمقابل حیا کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نوعمری سے ہی دونوں میں ایک فرق صاف نظر آنے لگتا ہے جب ایک نوعمر لڑکی کے طور طریقے، جسم کو چھپانے کا انداز، شرمیلا پن اور نسوانی ادائیں لڑکوں سے بالکل مختلف نظر آنی لگتی ہیں۔ اس فرق کے پیچھے یہ حقیقت از خود کارفرما رہتی ہے کہ عورت کی عصمت مرد کے مقابلے میں زیادہ قیمتی، انتہائی حساس اور نازک ہوتی ہے۔ نازک اشیاء کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے کہ انھیں احتیاط کے ساتھ برتیں (Fragile- Handle with Care) اسلام نے پردہ کے ذریعہ عورت کی حیا کے تحفظ کا اور حیا کے تحفظ کے ذریعہ اس کی عصمت کی حفاظت کا جو پختہ انتظام کیا ہے وہ یہی 'احتیاط کے ساتھ برتنا' ہے۔ (قرآن: ۲۴: ۳۰-۳۱)

یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو عورتیں جس قدر زیادہ پردہ (نمائش جسم سے پرہیز) کرتی ہیں وہ اسی قدر باعصمت ہوتی ہیں۔ مسلم معاشرے میں یہ تناسب دیگر معاشروں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کی تمام خواتین شیطان کے وسوسہ سے متاثر نہ ہونے کی قوت ارادی پیدا کرلیں اور اسلامی پردہ اختیار کرلیں تو بلا کسی تردد کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے خلاف جو کروڑوں کی تعداد میں مختلف قسم کی جنسی زیادتیاں ہوا کرتی ہیں اور استحصال، جنسی جرائم کے بے شمار واردات و حادثات آئے دن ہوتے ہیں، ان کی سطح کم و بیش ۹۵ فیصد تک نیچے گر جائے گی اور عورت کی عصمت کی حفاظت یقینی ہونے کے ساتھ معاشرے کے اخلاقی نظام کو بے شمار نقصانات وخطرات سے اور انتظامیہ وعدلیہ کو بے شمار مسائل سے نجات مل جائے گی۔

پردہ-اسلام کا موقف

اسلام انسان کے عقل وشعور کو اپیل کرتے ہوئے ہر معاملے اور مسئلے پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے کسی بھی پہلو یا کسی بھی شعبے میں فرد، معاشرہ اور تہذیب وتمدن کو محض فہم، ضمیر اور قوتِ شعور پر ہی مبنی ومنحصر نہیں رہنے دیتا یا اس کی تعلیمات محض نصیحت تک محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ زندگی سے متعلق تمام معاملات میں اصول و قوانین اور احکام بھی دیتا ہے۔ مختلف اندرونی و بیرونی وجوہ وعوامل کے مسلسل متحرک رہنے سے

انسان کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے ایسی کیفیت پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہونے لگے تو اسے بروقت چیک کر دیا جائے۔ اس کے لیے اسلام نے واضح احکام دیے ہیں۔ پردہ سے متعلق قرآن میں اس کے احکام بالکل واضح ہیں۔ (33:59, 24:31)

جو عورتیں حیا کو چھوڑ کر اور اپنی عصمت وعفت کی خود ناقدری کرتے ہوئے فحش لباس میں منظرِ عام پر آتی ہیں، یا جو عریاں حالت میں نائٹ کلبوں اور ڈسکو تھیکس میں ناچتی ہیں، یا مقابلۂ حسن اور ریمپ پر کیٹ واک کے فیشن شو میں حصہ لیتی ہیں، یا بلیو فلموں میں جماع کی حالت میں اپنے مکمل برہنہ جسم کی نمائش کرتی ہیں، ان کے برعکس ایک عام عورت خواہ وہ کسی بھی مذہب کی ماننے والی ہو عام طور پر اپنا جسم ڈھک کر رکھتی ہے۔ جس قدر اس کی صالح فطرت بیدار رہتی ہے اسی قدر اس کا لباس مہذب، ساتر اور مکمل ہوتا ہے۔ خاندان کے مرد اپنی اور اپنی خواتین کی عزت، عصمت، اخلاق اور کردار کے معاملے میں جتنا حساس ہوتے ہیں اسی تناسب میں اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو ڈھیلے، مکمل اور مہذب (Modest) لباس پہناتے ہیں۔ ہر عام شخص کو معلوم ہے کہ عورتوں کی عصمت اور عزت وآبرو کی حفاظت میں ان کے مہذب اور ساتر لباس کا خاص رول ہے۔ یہی لباس اسلامی تہذیب میں حجاب (پردہ) کہلاتا ہے۔ اسلام کا موقف یہ ہے کہ عورتوں کو خود اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کے لیے اور سماج میں بدکاری وجنسی انارکی پیدا نہ ہونے دینے کے لیے بھی، لازماً پردہ کرنا چاہیے۔ ہندوستان کی مشہور اور ممتاز ملیالی ادیبہ خاتون محترمہ کملا داس نے اسلام میں اسی پردہ کے نظام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ کیرالا کی یہ خاتون (کملا ثریا) اسلامی پردے کو عورت کی عصمت کی حفاظتی زرہ (Security Jacket) کہتی تھیں۔

پردہ کی اسلامی حکمت

اسلام جب پردے کے قانون پر عمل عورتوں کے لیے لازمی قرار دیتا ہے تو اس کی یہ حکمت بھی بتاتا ہے 'تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں۔' (۵۹:۳۳) اس بہ ظاہر چھوٹی اور معمولی سی بات میں حقیقتاً حکمت کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

اسلامی پردہ کا حکم اُس ماحول میں آیا تھا جب آج جیسی بے حیائی، برہنگی، عریانیت، فحاشی، بدکاری اور جنسی جرائم کی کیفیت نہ تھی۔ پھر بھی عورت کی فطرتِ سلیم میں بگاڑ آجانے سے، اور مردوں کے اندر بھی فطری طور پر جنسی داعیہ بہت تیز ہونے کی وجہ سے، بگاڑ کے جو کچھ امکانات

ہو سکتے تھے انھیں روکنے کے لیے اسلام نے یہ ایک احتیاطی تدبیر اختیار کی کہ عورتیں لباس ہی ایسا پہنیں کہ اگر سماج میں کچھ کم زور کردار کے مرد ہوں تو کسی لڑکی یا عورت کو پردہ میں دیکھ کر پہچان لیں کہ یہ ایک شریف اور عفت مآب عورت ہے، اس سے کسی غیر اخلاقی جنسی رسپانس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آج جب کہ ماحول بہت بگڑا ہوا ہے اور عورتوں کو ستائے جانے (چھیڑ چھاڑ، زبانی چھیڑ خانی، اغوا، زنا، زنا بالجبر، اجتماعی عصمت دری اور بعض اوقات اس کے بعد قتل بھی) کے حادثات بہت ہو رہے ہیں، اسلام کے اس حکم پر عمل کی ضرورت زیادہ شدید ہے۔ ایسے بگڑے ماحول میں بھی، عام مشاہدہ ہے کہ پردہ دار خواتین ستائی جانے سے محفوظ رہتی ہیں۔ کاش، لوگ پردہ پر اعتراض کرنے کے بجائے اس کی اسلامی حکمت کو سمجھتے اور پردہ پر عمل پیرا ہو جاتے۔

ترقی کی راہ میں 'پردہ' حائل؟

پردہ کی مخالفت کرنے والوں کی 'دلیل' یہ ہے کہ پردہ دار خاتون گھر کی چار دیواری میں قید، گھریلو مشغولیات میں پھنسی، بچے پیدا کرنے والی مشین بنی، ملک اور قوم کی ترقی میں سرگرم کردار ادا کرنے سے محروم رہ جاتی ہے۔ یہ اسلام کی بہت بڑی غلطی اور بڑی خامی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی ترقی اور خوش حالی جو عورت کی عصمت، حیا، ناموس اور نسوانیت کو داؤں پر لگا کر حاصل کی جائے، چاہے اس میں مادّی چمک و چکا چوند جتنی بھی ہو، اس میں اس کی سخت ناقدری اور ذلت ہے۔ ایسی نام نہاد ترقی حقوقِ نسواں کا نہیں، عورت کے استحصال اور اس کے حقوق کی پامالی کا مظہر ہے۔ پردہ ایسی ترقی میں رکاوٹ ہرگز نہیں ہے جو عورت سے اس کی حیا اور اس کی نسوانیت و عصمت کی قیمت وصول نہ کرے۔ ایسی ترقی، ترقی کہلائی جانے کی مستحق نہیں ہے جو عورت سے اس کے شرفِ نسوانیت کا نشانِ امتیاز چھین لے۔

ترقی میں بے پردہ خواتین کا کردار — آئینہ بولتا ہے

اسلام کی نگاہ میں فطری، حقیقی اور مطلوب ترقی وہ ہے جس میں مادّیت پر روحانیت و اخلاقیات کا غلبہ ہو۔ تہذیب و تمدن میں انسانی و اخلاقی قدروں اور زندگی کے مادّی پہلو میں توازن و تال میل ہونا چاہیے۔ اس عمومی عمل میں عورت سے متعلق اخلاقی قدروں کو خصوص حاصل ہے۔ اس سلسلے میں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ عورت کا جسم جس قدر بے پردہ ہو کر عام نمائش

کے لیے کھلے عام کسی آزادرَو اور بے لگام معاشرہ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اتنا ہی اس کے اخلاقی اقدار کی پامالی اور اس کا جنسی استحصال ہوتا ہے۔ ترقی میں بے پردہ خواتین کے جس رول کا دعویٰ کیا جاتا ہے، وہی رول انجام دیتے ہوئے تو عورت کو (گھر سے باہر کے) ہر میدانِ کار میں مردوں کی جنسی جارحیت کا شکار ہونا دورِ حاضر کا سب سے بڑا اور پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا ہے، جو لاکھوں تدبیروں کے باوجود حل نہیں ہو پا رہا ہے۔ کیا ایسی الم ناک صورتِ حال کو 'عورت کی ترقی'، یا 'تمدنی ترقی میں عورت کے رول' کے پردے میں چھپایا جاسکتا ہے؟

ایک تحقیقی کتاب 'ویمن ان اے چینجنگ سوسائٹی'' (طباعت: ۱۹۹۳ء) کی ذہین مصنفہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتی ہیں:

> ''ہندوستان میں (مسلم...) حکومت کے آتے ہی پردہ کا رواج شروع ہوا اور عورتیں گھر کی چہار دیواری میں مقید ہوگئیں۔ ان کی تعلیم کو دھکا لگا، باہر کی دنیا میں ان کا رول بہت کم ہوگیا.....''

دانش ور مصنفہ کا یہ تبصرہ تین پہلوؤں سے غلط ہے:

اول: ہندوستان میں مسلم حکومت آنے سے پہلے بھی غیر مسلم خواتین میں مہذب و شائستہ لباس پہننے کا رواج تھا۔ سماج میں بالعموم عریانیت، فحاشی اور جنسی ہیجان خیزی والے لباس مروج نہ تھے، کیوں کہ عورتیں اپنے فطری دائرۂ کار میں گھر تک ہی محدود رہتی تھیں۔ وہ اپنی عصمت و عفت کے معاملے میں حساس ہوا کرتی تھیں اور گھر سے باہر کی دنیا میں نکل کر اپنے شرفِ نسوانیت کو متاعِ بازار نہیں بنایا کرتی تھیں۔

اوّل: 'گھر کی چہار دیواری میں بند ہو رہنا' ایک ایسا محاورہ ہے جو خاندان جیسے بنیادی، اہم اور تعمیری ادارے کی تحقیر کرتا ہے۔ جس گھر کی چہار دیواری میں انسان بنتے ہوں، اُن کی فطری نشو ونما ہوتی ہو، جہاں نئی نسلوں کی تربیت، اٹھان اور اخلاقی ارتقاء کے اہم مرحلے طے ہوتے ہوں، جہاں عقائد و اقدار اور صالح روایات کی بنیادیں ڈالی جاتی ہوں، جہاں زوجین ایک دوسرے سے سکون و محبت حاصل کرتے اور بچے اپنی ماں کی مامتا و شفقت پاتے ہوں، جہاں عورت ملکہ اور مالکہ بن کر رہتی ہو، جہاں اس کی عصمت و عفت مامون و محفوظ رہتی ہو، اسی گھر اور اس کی چہار دیواری کو عورت کے لیے قید و بند کہنا عورت کی تذلیل اور معاشرت کی توہین ہے۔

سوم: مسلم حکومت آنے پر جب باضابطہ پردہ مروج ہوا تو ایسی فضا قائم ہوگئی جس میں عورت کو

سماجی، معاشی اور جنسی تحفظ (security) مل گیا۔ وہ گھر کی دنیا کی ملکہ بن گئی۔ مستقبل کے لیے، گھر کے باہر کی دنیا میں اس کے ممکنہ جسمانی و جنسی استحصال کے راستے بند ہو گئے۔ 'باہر کی دنیا میں' عورت کے، رول انجام دینے کا نتیجہ فاضل مصنفہ نے خود ہی تحریر کر دیا ہے، گویا آئینہ بولتا ہے:

''آج زنا بالجبر کے اعداد و شمار ایک افسوس ناک صورتِ حال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ ہندوستان میں روزانہ ۳۳/اور سالانہ ۲۰/ہزار عورتوں کے ساتھ عصمت دری کے واقعات ہوتے ہیں۔ ہندی بیلٹ (یوپی، بہار، ایم پی، راجستھان وغیرہ) ۱۹۸۸ء میں ۲۶,۳۸۹ اور ۱۹۸۹ء میں ۳۰,۳۲۰ اور ۱۹۹۰ء میں ۳۱,۰۱۴ واقعات عورت کے خلاف جرم کے ہوئے۔ غیر ہندی بیلٹ میں یہ اعداد و شمار بالترتیب ۲۲,۲۲۴، ۲۳,۸۵۳ اور ۲۳,۸۵۳ ہیں۔ ویسے تازہ صورتِ حال بتاتی ہے کہ مغربی بنگال، تری پورہ، اڑیسہ جیسی محفوظ ریاستوں میں زنا بالجبر کے واقعات کثرت سے ملتے ہیں۔ 'میری اسٹوپس' دہلی کے مطابق ہر سال دو کروڑ عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ ہندوستان میں زنا بالجبر ہوتا ہے اور ۲۰/میں سے صرف ایک ہی معاملے کی ایف آئی آر درج ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۱۴۸)

ترقی میں عورت کے کردار کے محولہ بالا 'خوش گوار' سفر پر چوتھائی صدی گزر جانے کے بعد اب مندرجہ بالا اعداد و شمار میں کتنا اضافہ ہو چکا ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو اور دوسری تنظیموں کے ذریعہ سال بہ سال پیش کیے جا رہے اعداد و شمار بے پردگی، فحاشی اور پردہ مخالف جنسی بے راہ روی کے برے نتیجے یعنی عورتوں کی جنسی ذلت و استحصال کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تصویر بھی پوری اور سچّی نہیں ہوا کرتی۔ مذکورہ واقعات میں بہت ہی کم کی رپورٹ لکھائی، یا پولیس کے ذریعہ لکھی جاتی ہے۔ بیدار ذہن اور حساس دل ہو تو یہ حقائق پردہ کے متعلق اسلام پر اٹھنے والے سوالوں کے جواب خود بخود فراہم کر دیتے ہیں اور الزامات، اعتراضات اور غلط فہمیوں کا ازالہ خود بہ خود کر دیتے ہیں۔

چہرے کا پردہ

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ خواہ زنا کاری ہو یا عورتوں و لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ خانی یا ان کا اغوا اور ان کے ساتھ زیادتی، ان حادثات اور برائیوں کا نقطۂ آغاز ان کا چہرہ ہے۔ چہرہ ہی ان سب کے داخلے کا دروازہ ہے۔ اور اگر آرائش و زیبائش کے ذریعہ غیر مرد کے شہوانی جذبات کو بھڑکانے اور انھیں رجھانے کے لیے چہرے کو دلکش (Sex appealing) بنایا

جائے تو گویا اس دروازے کے پٹ کھول دیے گئے اور عورت کی عصمت کو خطروں کے حوالے کر دیا گیا۔

اسلام نے عورت کی بیش قیمتی نسوانیت کو محفوظ رکھنے کے لیے حکم دیا کہ وہ عام حالات میں (گھر سے باہر نکلے تو) اپنے جسم کے ساتھ ساتھ اپنا چہرہ بھی چھپا کر رکھے (قرآن، ۳۳:۵۹) اور غیر معمولی حالات میں جب بہت ضروری ہو تو اپنا چہرہ غیر مرد کے سامنے کھول سکتی ہے۔ لیکن یہاں بھی اسلام اس کو پوری احتیاط برتنے کا حکم دیتا ہے کہ عورت میک اپ اور آرائش وزیبائش کے ذریعہ (صرف اپنے شوہر کے علاوہ) کسی بھی غیر مرد کے لیے دل کش اور شہوانی جذبات کو بھڑکانے والی بن کر، چہرہ کھول کر گھر سے باہر نہ نکلے۔

پردے کی مخالفت کا ایک اہم سبب

جو لوگ نسوانی وقار اور عورت کی عفت وعصمت کے سلسلے میں بے حس یا غیر حساس واقع نہیں ہوتے ان کا ضمیر پردے کی اہمیت پر مطمئن ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تہذیبی یا رواجی وجوہ سے وہ پردے پر عمل یا اس کی کھل کر حمایت نہ کر پاتے ہوں۔ لیکن ان کی فطرتِ سلیمہ انھیں پردے کی مخالفت نہیں کرنے دیتی۔ پردے کی مخالفت کی ایک عمومی وجہ یہ ہے کہ لوگ یہ نہیں چاہتے کہ عورت کے حسن وشباب کے نظارے سے لذّت حاصل کرنے میں پردہ رکاوٹ بنے۔ لیکن پردہ کی ہمہ گیر اور شدید و مسلسل مخالفت کی ایک دوسری بڑی وجہ بھی ہے۔

نہ جانے کتنی صنعتیں، انڈسٹریاں اور کاروبار عورت کی نمائشِ جسم اور اس کے جسم وشباب کے غیر اخلاقی استعمال وجنسی استحصال پر چل رہے ہیں، نیز ان کی ترقی، کشش، رفتارِ کار، سماجی مقبولیت اور عام پذیرائی میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مثلاً کاسمیٹک انڈسٹری، سیکس انڈسٹری، فلم انڈسٹری، فیشن انڈسٹری، پورن (porn) انڈسٹری، عالمی اور ملکی پیمانے پر مقابلۂ حسن انڈسٹری، کال گرلز انڈسٹری، بلیو فلم انڈسٹری، کیٹ واک آن ریمپ انڈسٹری، ایڈورٹائزنگ انڈسٹری، سیکس ٹورزم، ویمن ٹریفکنگ انڈسٹری، نائٹ کلب انڈسٹری، ڈیزائنر فیشن انڈسٹری، جینس (Jeans) انڈسٹری، بیوٹی پارلر انڈسٹری، خواتین کے جسم اور کچھ اعضاء کو سڈول (Slim)، اسمارٹ پرکشش بنانے والے سامان کی انڈسٹری، لیڈیز جم انڈسٹری، وغیرہ..... جن کا مجموعی سالانہ اربوں کھربوں ڈالر کا ٹرن اوور ہوتا ہے..... پردہ سے ان کا آؤٹ ریچ (out-reach)،

ان کی مارکیٹنگ، کسٹمر شپ، کاروبار، دھندھا سب متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا کارپوریٹ سیکٹر اور بزنس ورلڈ پردہ کی مخالفت میں، میڈیا، حکم رانوں، اور فیمنسٹ تحریک (Feminist Movement) کو استعمال کرنے میں سب سے زیادہ فعال رول ادا کرتا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ عورت ذات کے خیر خواہ و مخلص لوگ (مرد و عورتیں دونوں) بھی کارپوریٹ ورلڈ، صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے خود غرضانہ، مفاد پرستانہ، پردہ مخالف عزائم و منصوبوں کو سمجھ نہیں پاتے اور (غالباً بے شعوری میں) اس اسلامی نظامِ پردہ کے مخالف بن جاتے ہیں، جو عملی سطح پر عورت کی بیش قیمت نسوانیت کے تحفظ کی ضمانت اور اس کی نہایت قیمتی عصمت و عفت کی حفاظت کرنے والا ایک مضبوط قلعہ ہے۔

مغربی دنیا کی گواہی

اطلاعاتی ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں بغیر کسی زحمت کے صرف انگلیوں کی ذرا سی جنبش سے مغربی دنیا کا بدلتا ہوا منظر نامہ دیکھا جا سکتا ہے، جہاں سال بہ سال اوسطاً اسلام قبول کرنے والے لاکھوں انسانوں میں تین چوتھائی عورتیں ہوتی ہیں۔ ان کی خود نوشت (Autobiography) بتاتی ہے کہ ان میں سے قابلِ ذکر تعداد اسلام کے نظامِ پردہ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتی رہی ہے۔ یہ عورتیں جاہل، بے وقوف، ان پڑھ، غریب، ذہنی سماجی و معاشی طور پر پس ماندہ اور 'فنڈامنٹلسٹ'، تنگ ذہن، تاریک خیال (جیسا کہ پردہ نشین خواتین کو القاب دیے جاتے ہیں) نہیں ہوتیں، بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین و عقل مند، اہلِ دانش، ماڈرن، ترقی یافتہ، اونچے کیریئر والی، اونچے عہدوں پر فائز، خوش حال اور دولت مند ہوتی ہیں۔ اُن میں سے اکثر وہ ہوتی ہیں جو نسوانی خود اختیاری (Woman-Empowerment)، آزادی (Liberty)، جنسی آزادی، مردوں سے بے حجابانہ و آزادانہ اختلاط اور 'بے پردگی' و نمائشِ جسم کے سارے 'مزے' لوٹتے لوٹتے اندر سے ٹوٹ چکی، کھوکھلی ہو چکی اور شرفِ نسوانیت سے محروم ہو چکی ہوتی ہیں۔ پھر 'اسلامی پردہ' میں انھیں اپنے اندر مر چکی عورت کی ایک نئی، پُر وقار اور عفت مآب زندگی کا سامان نظر آ جاتا ہے۔ فطرت سے لڑتے لڑتے بالآخر فطرت کے آغوشِ رحمت میں پناہ گزیں ہو جاتی ہیں۔ کیا یہ پردہ کی عظمت و افادیت کی ایک کھلی دلیل نہیں ہے؟

ꕥ

باب: ۴

جہاد: قتل و غارت گری، دہشت گردی؟

''جہاد قتل، قتلِ عام، خوں ریزی، بدامنی، ناانصافی، جرم اور دہشت کا نام ہے۔ 'جہاد کرنے والا' سنگ دل اور خوں ریز شخص بن جاتا ہے۔ جہاد حقوقِ انسانی اور امنِ عالم کا دشمن ہے۔''

تمہید

جہاد ان بے شمار موضوعات میں سے ایک خاص اور اہم موضوع ہے جنھیں اسلام کے اپنے ذرائع اور قابلِ اعتماد حوالوں سے سمجھنے کے بجائے غیر اسلامی، اسلام مخالف اور اسلام دشمن ذرائع سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

ایسی صورتِ حال میں اسلامی جہاد کی غلط اور خوف ناک تصویر پیش کی گئی اور مفاد پرست حکم رانوں نے میڈیا کے ذریعے دنیا کو یہ باور کرانا چاہا کہ جہاد ظلم و زیادتی کا دوسرا نام ہے۔ لاعلمی اور غلط فہمیوں کی وجہ سے مندرجہ بالا اعتراضات پوری دنیا میں تیزی سے پھیل گئے۔ کسی بھی سنجیدہ حقیقت کو سمجھنے کا مناسب ذریعہ میڈیا یا سیاست دانوں کے بیانات نہیں ہوا کرتے، بلکہ خود اس سے راست متعلق، قابلِ اعتماد ذرائع ہوتے ہیں۔

جہاد کا مطلب

جہاد عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ 'ج، ہ، د' ہے۔ اس سے بننے والے الفاظ قرآن میں کل ۱۷ ہیں اور ۱۹ رسورتوں میں ۴۱ بار استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے معنی ہیں: ناموافق حالات سے کش مکش اور اس میں سخت محنت، کوشش و کاوش۔ جس جہاد پر اعتراض کیا جاتا ہے وہ کوشش و کاوش اور مزاحم عوامل کے مقابلے میں کش مکش کے مختلف مراحل اور درجوں میں ایسا آخری اور انتہائی مرحلہ ہے جہاں مسلح کش مکش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ایسے 'جہاد' (' قتال' یعنی جنگ) پر علمائے قرآن اور مفسرین نے بہت تفصیل سے لکھا ہے اور اس موضوع پر مختلف ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں کافی لٹریچر بھی موجود ہے۔ مندرجہ بالا اشکالات، غلط فہمیوں اور اعتراضات کے صحیح

اور مبنی برحقیقت جواب وازالہ کے لیے اس لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہاں مختصراً اور کم سے کم الفاظ میں اگر جہاد کی حقیقت بیان کی جائے تو وہ کچھ یوں ہوگی۔

جہاد کی مختصر تعریف

''ظلم و ناانصافی اور استحصال کرنے والی طاقتیں، خوں ریزی، قتلِ عام کرنے اور تباہی و بربادی پھیلانے والی طاقتیں، کم زوروں پر ظلم ڈھانے والی انھیں ان کی بستیوں، آبادیوں، گھروں سے نکال دینے یا نکلنے پر مجبور کردینے والی طاقتیں، ایسے کام مسلح ہوکر کریں تو مسلم امت اور مسلم حکومت کی ذمہ داری ہے کہ نہ صرف ظلم کا مقابلہ اور اپنی حفاظت کی جائے، بلکہ ظالم کی ظالمانہ قوت وصلاحیت کو کم زور کرکے ظلم واستبداد کا خاتمہ کیا جائے۔ سچائی، تکریمِ انسانی اور امن و انصاف کے قیام کی راہ میں حائل شیطانی قوتوں کو شکست دی جائے۔ دینِ حق کا وہ راستہ ہموار کیا جائے جس پر چل کر انسانی معاشرہ اور نوعِ انسانی دنیوی اور اخروی کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہوسکے۔ اس مسلح کش مکش میں خود ظلم و ناانصافی کرنے سے مکمل اجتناب کیا جائے۔ اللہ کے احکام، اصول، تعلیمات اور حدود کی پابندی کی جائے۔''

یہ اسلامی جہاد کی مختصر ترین (عام فہم) تشریح ہے۔ ظلم، استبداد اور استحصال کے خلاف نوع انسانی کی طویل تاریخ میں مسلّح مزاحمت اور جنگ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ نوعِ انسانی نے ظلم وستم کے سامنے ہمیشہ گھٹنے ٹیک دیے ہوں۔ ایسا ہونا اُس اصل فطرت کے برعکس ہے، جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اگر اس طرح کی جنگ بالکل ہی نہ ہو تو اللہ کی زمین کا چپہ چپہ ظلم وفساد سے بھر جائے۔ البتہ یہ صرف اسلام کا امتیاز ہے کہ اس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ ظلم کے بدلے میں ظلم ہرگز نہ ہونے پائے۔ جذبۂ انتقام ایسا قوی ہرگز نہ ہونے پائے کہ انصاف، اخلاق اور انسانیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ (قرآن، ۵:۸)

جہاد: دہشت گردی؟

جہاں تک جہاد کا دہشت گردی سے تعلق کا سوال ہے، سوامی لکشمی شنکر اچاریہ کے مطابق (کتاب 'اسلام آتنک یا آدرش' ۲۰۰۸ء) پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ ۲۳ رسالوں تک دہشت گردی کے خلاف لڑتے رہے، یہاں تک کہ مکہ شہر اور قریبی علاقوں سے ظلم ودہشت کا صفایا ہوگیا۔ اسلام میں جہاد دراصل دہشت کو ختم کرنے، دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کا ایک مقدس عمل ہے۔ اس

عمل سے ظالم قوتیں دہشت زدہ ہوتی ہیں، لہٰذا جہاد کو دہشت گردی کا نام دیتی ہیں، ورنہ خود جہاد کو دہشت گردی قرار دینا ایک افتراء کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کسی مغربی دانشور کے یہ الفاظ صورتِ حال کو اس کی صحیح شکل میں پیش کرتے ہیں:

"Terrorism of the powerful is called war, and war of the weak is called terrorism."

(طاقت ور کی دہشت گردی جنگ، اور کمزور کی جنگ دہشت گردی کہی جاتی ہے)۔

جہاد پر اعتراض کے ضمن میں اسلام یا مسلمانوں کی پوزیشن سمجھنے کے لیے دو زاویوں سے موجودہ دنیا کا منظر نامہ دیکھ لینا بھی مفید ہوگا:

۱- مختلف داخلی یا خارجی قوتوں کے مظالم سے تنگ آکر، انصاف و امن کے تمام دروازے بند پا کر کچھ مسلمانوں کے گروپس مایوسی اور ذہنی انتشار کی کیفیت میں آخری چارۂ کار کے طور پر اسلحہ اٹھا لیتے ہیں۔ (ان کی مدافعانہ یا انتقامی، یا مزاحمتی کارروائیوں میں بعض اوقات کچھ بے قصور لوگ بھی مارے جاتے ہیں جس کی تائید اسلام نہیں کرتا)۔ لیکن قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ اسے 'جہاد' نہیں کہتے۔ کیوں کہ ان کا یہ عمل اسلامی اصولِ جہاد سے کنٹرول نہیں ہوتا، بلکہ محض ایک فطری انسانی ردِّعمل ہوتا ہے۔ ظلم کرنے والی وہ قوتیں خود ہوتی ہیں جو اسے جہاد کا نام دے دیتی ہیں۔ پھر جہاد کے اسلامی تصور کے خلاف پوری دنیا میں ایک طوفانِ نفرت برپا کر دیتی ہیں۔

۲- وہ ظالم طاقتیں جو کم زور (مسلم) ملکوں میں بدامنی، انتشار اور خانہ جنگی پیدا کر کے یا ان پر یک طرفہ چڑھائی کر کے اپنے سیاسی، معاشی اور صنعتی مفادات حاصل کرنا چاہتی ہیں، خود ہی اپنی تخریب کار خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ 'اسلامی' ناموں سے زیرِ زمین گروپس تیار کرتی ہیں۔ ان سے بم دھماکے کراتی ہیں اور آناً فاناً 'جہادی'، 'جہادیوں' اور 'جہادسٹوں' وغیرہ القاب کے ساتھ، اپنی خود ساختہ پرداختہ جعلی 'اسلامی تنظیموں' کے سر ساری ذمّہ داری منڈھ دیتی ہیں اور اپنی طاقت ور میڈیا مشینری کے ذریعہ اس سے پوری دنیا کے کان اور دماغ بھر دیتی ہیں۔

ان زمینی سچائیوں سے جو لوگ بخوبی واقف ہوتے ہیں، یا تو اُن کی کوئی آواز ہی نہیں ہوتی، یا ہوتی ہے تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کی مانند سنی نہیں جاتی، اور جو لوگ ناواقف ہوتے ہیں وہ ہٹلر کے پروپیگنڈا انچارج 'پال جوزف گوئبلس' کے اس طریقۂ کار سے متاثر ہو جاتے ہیں کہ 'ایک جھوٹ کو سو بار بولا جائے تو بالآخر وہ سچ مان لیا جاتا ہے۔'

ꕥ

باب:۵

کافر — مذہبی گالی؟

''قرآن میں لفظ 'کافر' ہندوؤں کے لیے ذلت آمیز ہے اور گالی کے مترادف استعمال ہوا ہے۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ انھیں مارو، کاٹو۔ لہٰذا اس سے ہندوستانی معاشرے میں نفرت اور دشمنی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے؟''

تمہید

حقیقتاً اگر ایسا ہوتا، جیسا کہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے، تو دنیا، خصوصاً ہندوستان کے بے شمار غیر مسلم دانشوروں، مفکروں اور مؤرخوں نے اسلام کے بارے میں مندرجہ بالا اعتراض کے خلاف سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات سیاہ نہ کر دیے ہوتے۔ یہ الزام اور اعتراض زیادہ تر نادانی اور کچھ حد تک غلط فہمی یا پروپیگنڈہ کی وجہ سے ہے۔

'کافر' کے معانی

کافر لفظ تین عربی اصل حروف 'ک، ف، ر' سے بنا ہے۔ قرآن میں اس مادّے سے بنے ۵۴ الفاظ میں سے ۵۱/الفاظ (جو ۷۴ سورتوں کی ۴۷۹ آیات میں ۵۲۱ بار آئے ہیں)، درج ذیل مفاہیم میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان تمام الفاظ کا اصل لفظ 'کفر' ہے۔ کافر کا معنی ہے کفر کرنے والا۔

کفر کے کئی معنی ہیں۔ مثلاً انکار کرنا، چھپانا، ہٹانا، دور کرنا، مخالف کام کرنا، دبا دینا، نافرمانی کرنا، چھوڑ دینا وغیرہ۔ (کسان کے زمین میں بیج دبا دینے کے عمل کے لیے بھی عربی میں کفر لفظ استعمال ہوا ہے)۔

اصطلاحی معنی

اسلام اور قرآن کی اصطلاح میں 'کفر' کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے اسلام کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس پر ایمان لانے کے بجائے اسلام کا انکار کر دینا۔ دل و دماغ پر حق واضح ہو جانے کے بعد بھی اسے چھپا لینا، دبا دینا، ٹھکرا دینا۔ یہ لفظ خود مسلمانوں کی شبیہ میں منافقوں کے اس عمل کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جو اسلام کی کچھ باتوں پر عمل کرنے اور کچھ کو چھوڑ دینے، اللہ کی جزوی یا کلی نافرمانی، اوپر سے ایمان، لیکن اندر سے اہلِ ایمان کی مخالفت وغیرہ کی شکل میں کیا جائے۔ اسلام کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے خود مسلمانوں کے لیے کہا: ''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔'' قرآن کی چھ آیتوں (۵:۶۵، ۸:۶۶، ۹:۶۴، ۵:۴۸، ۲۹:۸، ۳۵:۳۹) میں خود اللہ نے اپنے لیے اسی لفظ کا استعمال کیا ہے۔ ''تو اللہ تم سے تمہاری برائیوں، گناہوں کو دور کر دے گا۔'' ایک آیت (۲:۲۷۱) میں فرمایا: ''اس سے تمہاری برائیاں مٹ جاتی ہیں۔''

گالی نہیں..... محض شناختی لفظ

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں لفظ 'کافر' غیر مسلموں کی تذلیل کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔ ہندوؤں کے لیے ذلت یا گالی کے بہ طور اس کا استعمال نہ ہونے کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن کے دورِ نزول (۶۱۰ء تا ۶۳۲ء) میں ہندو نام سے کوئی قوم نہ صرف عرب میں، بلکہ ہندوستان میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ (یہ 'ہندو' لفظ بعد کی صدیوں میں بنا ہے۔ مورخین نے اس کی تائید کی ہے۔) اس دور میں عرب قوم اور ہندوستانی قوم کے درمیان کوئی کش مکش بھی نہیں تھی۔

دراصل لفظ 'کافر' قرآن میں ایک پہچان طے کرنے والا لفظ (Word of Identification) ہے۔ یہ ایمان لانے والے (مومن/مسلم) افراد کے برخلاف ایمان (اسلام) کا انکار کرنے والے افراد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً گریجویٹ (Graduate) کے برخلاف 'نان گریجویٹ' (Non-Graduate) کا لفظ، جو بلا شبہ پہچان کے لیے ہے، نہ کہ تذلیل و توہین یا گالی کے طور پر۔

قرآن کا موقف

کافر کے لیے قرآن میں واضح طور پر دو قسم کی باتیں آئی ہیں:

(۱) اس زندگی (موجودہ زندگی) کے لیے۔
(۲) مرنے کے بعد کی (اخروی) زندگی کے لیے۔

چونکہ قرآن یعنی اسلام کا عام اصول ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسلام کو چاہے قبول کرلے یا انکار کرے، اس لیے دین (مذہبِ اسلام) میں زور زبردستی نہیں ہے (۲:۲۵۶)۔ اس لیے کافر کے ساتھ انصاف، حق، انسانی اقدار اور حقوقِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ کافر کے بارے میں قرآن میں جو باتیں پکڑنے، مارنے، قتل کرنے کی آئی ہیں، پورے سیاق وسباق کے ساتھ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جنگ کے احکام تھے۔ مسلمانوں (اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ) کو مکہ کے کافروں نے تیرہ سال تک ستایا تھا، اذیت دی تھی، بدنام اور ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی، دوبار مسلمانوں کو ان کا اپنا پیارا وطن مکہ چھوڑ کر حبشہ ہجرت پر مجبور کیا تھا، مکمل معاشرتی بائیکاٹ کرکے شہر سے باہر ایک گھاٹی میں تین سال تک سامانِ زیست سے اس طرح محروم کرکے جینے پر مجبور کردیا تھا کہ گھاس کھانے اور سوکھا چمڑا ابال کر اس کا پانی پینے کی نوبت آگئی تھی۔ بچے بھوک اور پیاس سے بلکتے تھے۔ توحید کو اپنانے کے جرم میں پوری مسلم آبادی کو اس حد تک اذیت دینے سے بھی جی نہ بھرا تو انھیں اپنا شہر (مکہ)، اپنا گھر بار، سامان، روزگار یہاں تک کہ بیوی بچے والدین وخاندان کو بھی چھوڑ کر سیکڑوں کلومیٹر دور مدینہ شہر کی طرف ہجرت پر مجبور کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی فوجیں اور اتحادی افواج (احزاب) لے کر مسلمانوں پر بار بار چڑھ آتے تھے اور پورے جزیرۃ العرب میں جگہ جگہ اسلام اور مسلمانوں کو عرب سے نیست ونابود کردینے کے لیے حملوں کی تیاریاں جاری رہتی تھیں۔ ایسے حالات میں اللہ نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ ان سے جنگ کرو، جہاں پاؤ، پکڑو، قتل کرو۔ یہ ایسے کام کی اجازت یا حکم تھا جو نوعِ انسانی کی پوری تاریخ میں حالتِ جنگ میں ہمیشہ معروف اور مقبول رہا ہے۔

قیامِ امن کے لیے ہر مہذب معاشرے نے ایسی جنگوں کو اپنایا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی دورِ حکومت میں مسلمانوں نے جتنی جنگیں لڑیں وہ یا تو اپنی حفاظت کے لیے تھیں یا عرب اور اس کے اطراف میں قیامِ امن اور بیرونی حملوں کو روکنے کے لیے (Pre-Emptive Wars) تھیں۔ جہاں تک موقع ملا اور جہاں تک ممکن ہوا انھوں نے ہمیشہ صلح کو جنگ پر ترجیح دی۔ ناجنگ معاہدہ کرنا (No-War-Treaty) پسند کیا۔

یہ تو کافروں کے بارے میں اس زندگی میں مسلمانوں کے لیے اسلام کی تعلیمات ہیں۔ رہیں اس زندگی بعد کی زندگی سے متعلق باتیں، تو زندگی بعد الموت کے لیے اللہ نے کافروں (دینِ حق کے انکار کرنے والوں) کے لیے قرآن میں کئی مقام پر ان کے انکار کی سزا کے تذکرے کیے ہیں۔ یہ بالکل اللہ اور اس کے بندوں کے بیچ کا معاملہ ہے۔ اور اللہ جو اپنے تمام بندوں کا خالق، رب، مالک اور پروردگار ہے وہ اپنے بندوں کے بارے میں ان کے اعمال کے مطابق آخرت کی زندگی کے لیے جو بھی فیصلہ کرے اس کا اسے اختیار ہے۔ اس میں کسی مسلمان کا کوئی کردار (Role) نہیں، نہ اللہ کے اس دائرۂ اختیار میں کسی بھی شخص کی مداخلت ممکن ہے، خواہ وہ مسلمان ہو، یا نہ ہو۔

کافروں کے ساتھ سلوک

ایسے کافروں کے ساتھ جو مسلمانوں سے لڑتے نہیں، انھیں ستاتے نہیں، ان پر ظلم کے پہاڑ نہیں توڑتے، انھیں ان کی آبادیوں، بستیوں، شہروں سے نہیں نکالتے، ان کے خلاف برسرِ پیکار نہیں ہوتے، کم زوروں کو دبا کر ان کا جینا دوبھر نہیں کرتے، اسلام نے وسیع القلبی، محبت، عزت و احترام، انصاف اور پرامن طریقہ سے رہنے، نیکی اور خیر کے اعمال، نیز معروفات میں تعاون دینے، تعاون لینے، اور ٹھیک مسلمانوں ہی کی طرح ان کے انسانی حقوق ادا کرنے اور حقوق کے تحفظ کی تعلیم اور احکام دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ لفظ 'کافر' ایک اسمِ صفت (Qualitative Noun) ہے، جس کا کسی مخصوص قوم، نسل، علاقہ، گروہ، طبقہ یا رنگ وغیرہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو بھی اسلام کا انکار کرے وہ پہچان کے طور پر 'کافر' یعنی کفر (انکار) کرنے والا کہلاتا ہے۔

کچھ مسلمان نادانی میں غیر مسلموں کو کافر/ کفّار کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی ہے۔ کسی شخص پر اسلام پوری طرح پیش کر دیا جائے اور وہ اچھی طرح سمجھ جائے کہ اسلام 'کیا ہے' اور 'کیا نہیں ہے؟' اور پھر اسلام کا انکار کر دے، اسے رد کر دے؛ تب ہی اسے کافر کہا جا سکتا ہے۔ اور وہ بھی ایسی حقارت اور تذلیل کے ساتھ نہیں کہ وہ اسے ایک گالی سمجھ بیٹھے۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر (غیر مسلم) شخص کو یہ آزادی دی ہے کہ جب اس پر حق واضح کیا چکا ہو تو وہ اسے قبول کر لے یا رد کر دے۔ اس پر کسی بھی طرح کا دباؤ نہیں ہے (قرآن، بقرہ، 2:256)۔

ꕥ

باب:۶

جبری تبدیلیِ مذہب؟

''ہندوستان کے مسلم دورِ حکومت میں غیر مسلموں کو زور زبردستی سے مسلمان بنایا جاتا رہا ہے۔اب لالچ دے کر مذہب تبدیل کرایا جارہا ہے۔ یہ سازش بھی ہے کہ مسلم نوجوان ہندو لڑکیوں سے تعلقات بڑھائیں، مذہب تبدیل کرائیں اور شادی کر کے اپنی آبادی میں اضافہ کریں۔ یہ صورتِ حال نا قابلِ برداشت ہے۔اس سے فرقہ وارانہ کش مکش پیدا ہوتی ہے اور تشدد بھڑکتا ہے۔''

تمہید

جبری تبدیلیِ مذہب کا اِشو ہمارے ملک کے کچھ مخصوص حلقوں کی طرف سے کبھی کبھی اٹھا دیا جاتا ہے اور عام لوگ حقیقت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بہ آسانی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس موضوع پر یہاں تین جہتوں سے روشنی ڈال کر مندرجہ بالا شکایت یا غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اعتراض کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

(۱) تبدیلیِ مذہب کے بارے میں اسلام کا اصولی موقف

(۲) مسلم دورِ حکومت میں تبدیلیِ مذہب

(۳) موجودہ دور میں تبدیلیِ مذہب کے بارے میں مسلمانوں کا موقف۔

(۱) تبدیلیِ مذہب کے بارے میں اسلام کا اصولی موقف

اسلامی موقف، اصول وقوانین، تعلیمات اور احکام ونصائح کے اصل مآخذ دو ہیں:

(۱) اللہ کا پاکیزہ کلام قرآن مجید

(۲) حضرت محمد ﷺ کا اسوہ اور نمونہ

ان دونوں مآخذ میں پوری نوع انسانی کو مخاطب کر کے خالص توحید (اور رسالت

وآخرت) پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس ایمان کے مطابق پوری زندگی گزارنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ کبھی عقلی دلیل کے ذریعہ اور کبھی نوعِ انسانی کی طویل تاریخ کے حوالے سے اس ایمان وعمل کے دنیوی اور اخروی فوائد بتائے گئے ہیں اور اس سے انکار، نافرمانی اور اسے ٹھکرا دینے اور اس کی مخالفت کرنے کے دنیوی اور اخروی نقصانات بتائے گئے ہیں۔ اس کے بعد اسلام کا موقف یہ ہے کہ اس دعوت پر مثبت یا منفی ردِّعمل ایک یک سر انفرادی عمل اور بندے اور خدا کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ ایسے انفرادی ردِّعمل کو اسلام نے مکمل طور پر انسان کی عقل اور اختیار کا موضوع قرار دیتے ہوئے اس معاملے میں کسی عام مسلمان کو تو کیا اپنے رسولوں اور آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو بھی بندے اور خدا کے درمیان مداخلت کا حق نہیں دیا ہے۔

(قرآن، ۸۸:۲۲، ۲:۲۵۶)

(۲) مسلم دورِ حکومت میں تبدیلیِ مذہب

اگر مسلم دورِ حکومت میں اس طرح کے چند واقعات ہوئے ہیں تو وہ یقیناً اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہوئے۔ مسلم حکم راں اسلام کے نمائندے اور موجودہ دور کے مسلمانانِ ہند کے لیے اسوہ (Role Model) نہیں تھے۔ اگر ان میں سے کسی نے واقعتاً ایسا کچھ کیا ہے تو اسلامی تعلیم کے خلاف کیا ہے۔ اسے آخرت میں اس کی سزا ملے گی۔ موجودہ دور کے مسلمان اس کے لیے جواب دہ یا ذمہ دار نہیں ہیں۔

اوپر 'اگر' اور 'واقعتاً' کے الفاظ اسی وجہ سے استعمال کیے گئے ہیں کہ تاریخ ایسے واقعات کی نہ صرف یہ کہ تائید نہیں کرتی، بلکہ اس کی تردید کرتی ہے۔ برائے نام کچھ استثنا تو ہو سکتے ہیں۔ (یہاں تاریخ سے مراد وہ تاریخ نہیں ہے جو 'تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو' کی سوچی سمجھی پالیسی اور گہری سازش سے انگریزوں نے لکھی، یا جسے کچھ خاص ذہنیت کے اسلام دشمن اور مسلم مخالف ہندوستانی غیر مسلم اسکالر نے تیار کی ہے)۔ سچائی یہ ہے کہ بے شمار حقیقت پسند غیر مسلم اسکالروں، محققوں، مفکروں اور مؤرخوں نے مندرجہ بالا الزام کی بھرپور اور پُرزور تردید کی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان کے ایسے لٹریچر اور تحقیقی کاموں تک عام باشندگانِ ملک کی پہنچ نہیں ہے۔ اس مختصر سی تحریر میں مندرجہ بالا تردید کے اقتباسات اور حوالے نقل کرنے کا موقع نہیں ہے۔

اختصار کے ساتھ بس اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ان محققین کے مطابق اس دور میں ہوئے تبدیلیِ مذہب کے چار اسباب تھے:

۱- نسلی امتیازات (اونچ نیچ) کی وجہ سے صدیوں سے مظلوم اور پس ماندہ لوگوں نے اسلام میں مساوات، عزت و اکرام اور بھائی چارہ پا کر مذہب تبدیل کیا۔

۲- اسلام کے بنیادی عقائد کو اپنی فطرت کے عین مطابق پا کر اسلام قبول کر لیا۔

۳- اسلامی عبادات (جیسے نماز) کی سادگی، حسن و وقار اور دل کشی نے لوگوں کو اسلام کے قریب پہنچایا۔

۴- اسلامی تہذیب کے امتیازی اوصاف، حسن، وقار اور فضیلت نیز اس کی خاندانی، معاشرتی اور معاشی خوبیوں نے لوگوں کو اسلام کی آغوش میں پہنچایا۔

اسلامی نظامِ حکومت میں عدل و انصاف اور قیامِ امن نے لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ رام دھاری سنگھ دنکر، منشی پریم چند، ایم این رائے، راجندر نرائن لعل، کاشی رام چاولہ، بھیم راؤ امبیڈکر، وینگتا چلم اڈیار، پیری یار ای وی راما سوامی، لکشمی شنکر آچاریہ وغیرہ کچھ نام ہیں، جنھوں نے یا تو اسلام کی امتیازی خوبیاں بتائی ہیں یا مسلم دورِ حکومت میں تبدیلیِ مذہب کے حقیقی عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان عوامل میں 'جبر' کا تذکرہ کہیں نہیں ہے۔

(۳) تبدیلیِ مذہب- مسلم موقف

آج (اور برسوں سے) تقریباً پوری دنیا کی طرح ہندوستان کے باشندے بھی تبدیلیِ مذہب کر رہے ہیں۔ دیگر مذاہب کے مبلغین لوگوں کا مذہب تبدیل کرنے کے لیے جو بھی طریقے استعمال کرتے ہوں، نیز اس کی پشت پر ان کے کیا مقاصد ہیں؟ یہ اس تحریر کا موضوع نہیں ہے۔ البتہ ہندوستانی مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ لالچ دے کر یا زور زبردستی سے مذہب تبدیل کرانا گناہ ہے۔ اسلام انھیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ (اسّی کی دہائی میں جنوبی ہند کے کئی گاؤں کے سیکڑوں لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، اس وقت پیٹرو ڈالر کے استعمال کی بات خوب اچھالی گئی تھی۔ ملک کے طول و عرض سے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ وہاں پہنچے۔ 'سریتا' ہندی میگزین کے نمائندے بھی وہاں پہنچے تھے اور انھوں نے تفصیل سے لکھا تھا کہ پیٹرو ڈالر نے نہیں، بلکہ صدیوں سے اچھوت، دلت، استحصال کیے جانے

اور وسیع پیمانے پر ٹھکرائے جانے والے لوگوں کے لیے اسلام کے انسانی مساوات، عزت واحترام نے انھیں مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ کر کے انھیں اسلام کی آغوش میں پہنچایا تھا)۔ استحصال زدہ، دلت اور اچھوت ہونے کی کیفیت، ظلم وزیادتی اور کم تر سمجھے جانے کی صورتِ حال ابھی تک موجود ہے۔ یہی مذہب بدلنے کی کئی مثبت وجوہ میں سے ایک منفی وجہ بن رہی ہے۔

دعوت.....نہ کہ جبر

قرآن میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ''تم بہترین امت ہو، جو نوع انسانی (کی بھلائی) کے لیے برپا کیے گئے ہو۔'' (۳:۱۱۰) اور ''لوگوں کو اپنے رب کے راستے (راہِ حق) کی جانب حکمت، اچھے بول اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلاؤ۔'' (۱۶:۱۲۵)، اس طرح مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کی خیر خواہی میں لوگوں کی فلاح ونجات کے خواہش مند بن کر اسلام کی دعوت و تبلیغ کریں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں سے کچھ لوگ بے لوث ہو کر یہ مبارک کام انجام دے رہے ہیں، اسلام کا پیغام برادرانِ وطن تک پہنچا رہے ہیں، ان تک ان کی مادری زبان میں اللہ کا کلام قرآن مجید اپنی استطاعت کے مطابق پہنچا کر ابدی سچائی کے راستے کی طرف ان کی رہ نمائی کر رہے اور دنیا اور آخرت کے نفع یا نقصان کی حقیقتیں ان پر واضح کر رہے ہیں۔ ان کا کام صرف یہیں تک ہے اور پورا ملک اس کا گواہ ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ اگر اپنا مذہب تبدیل کر کے راہِ حق پر آنا پسند کرتے ہیں تو یہ ان کا ذاتی فیصلہ ہے اور ان کے اور اللہ کے بیچ ایک معاملہ ہے۔

'لَو جہاد (Love-Jihad)'... شرم ناک اعتراض

جہاں تک غیر مسلم لڑکیوں کے، شادی کے لیے مذہب تبدیل کرنے کی بات ہے، تو ۲۰۱۱ء میں، ملک کی ایک ریاست میں 'لو جہاد' (Love Jihad) نام کی اصطلاح کے ذریعہ خطرے کی گھنٹی بجائی گئی کہ ملک میں ایک نئی طرح کا جہاد شروع ہو گیا ہے کہ مسلم نوجوان غیر مسلم لڑکیوں سے عشق کر کے ان کا مذہب تبدیل کرائیں اور ان سے شادی کریں۔ اس بابت پولیس محکمے نے پوری چھان بین کے بعد بتایا کہ یہ صرف افواہ ہے، اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ مسلمانوں اور اسلام کی تصویر بگاڑنے کے لیے کچھ عناصر، افسوس کہ خود اپنی قوم کی بیٹیوں کی تذلیل اور بے عزتی پر اُتر آئے اور یہ ثابت کر دیا کہ اسلام دشمنی میں وہ کتنی پستی تک گر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر

ایسے کچھ انفرادی واقعات پیش بھی آ رہے ہیں تو یقیناً یہ مسلم قوم کی 'سازش' نہیں ہے، بلکہ اس میں اہم رول ماڈرن کلچر کا ہے۔

جدید تہذیب

مخلوط تعلیم کے دوران اسکولوں کالجوں میں، نیز ملازمت کے اوقات میں دفتروں اور کام کی جگہوں پر نوجوان لڑکوں لڑکیوں کا آزادانہ میل جول، تنہائی میں ملاقاتیں، فطری طور پر دونوں کو کچھ زیادہ ہی قریبی رشتہ بنانے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ نوجوان لڑکوں لڑکیوں کو 'بوائے فرینڈ شپ'، 'گرل فرینڈ شپ' کلچر کا تحفہ جس پر ہمارے معاشرے کا جدت پسند طبقہ بہت فخر کرتا ہے، اسلام یا مسلمانوں نے نہیں دیا ہے۔ یہ قریبی تعلقات اندر ہی اندر کس طرح کی غیر اخلاقی بلکہ اخلاق سوز صورتیں اختیار کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں، اس سے بے پروا اور غیر حساس معاشرہ کے پاس اس بات پر اعتراض کا جواز نہیں رہ جاتا ہے کہ کسی نوجوان لڑکے لڑکی نے آپس میں شادی کر کے خود کو اخلاق سوز حرکت اور بدعملی و بدکرداری سے بچالیا۔ تیزی سے تبدیل ہوتے معاشرتی ماحول کے کچھ خال خال انفرادی واقعات کو مسلمانوں کی سازش قرار دینا شرارت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ اسلام کسی غیر مسلم (مرد یا عورت) سے شادی کی گنجائش بالکل نہیں رکھتا ہے۔ لہٰذا شادی کے خواہش مند 'عاشق' جوڑے میں سے حسبِ واقعہ، کسی ایک کو اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کر کے دائرۂ اسلام میں آجانا لازم ہی قرار پاتا ہے۔

اسلام کی خوبی اور کشش..... یا 'جبر'؟

مادّہ پرستی میں ڈوبی 'جدید' دنیا نے انسانوں کو جسمانی آرام و آسائش کے لیے بہت کچھ دیا، سامان و سہولیات کے ڈھیر لگا دیے، لیکن اسی تناسب میں انھیں سکونِ قلب اور روح کی آسودگی سے محروم بھی کر دیا۔ لاتعداد عقائد، مذاہب، نظریات اور افکار و فلسفے اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انسانوں کی اس تشنگی اور محرومی کا مداوا نہ کر سکے۔ ایسی عالم گیر کیفیت اور ہمارے ملکی ماحول میں جو سعید روحیں اپنی اس محرومی اور پیاس کا مداوا پالیتی ہیں اور اسلام کے سایۂ رحمت میں آجاتی ہیں تو یہ اُن کی خوش بختی اور اسلام کی خوبی ہے۔ اس حقیقت کو 'جبر' کے الزام کی بھینٹ چڑھا دینا، بجائے خود ایک (الگ ہی نوعیت کا) جبر ہے۔

ꕥ

باب:۷

اسلامی سزائیں: بے رحمی و بربریت؟

''اسلامی سزائیں بڑی ظالمانہ اور بے رحمانہ ہیں۔ موجودہ دور میں دورِ جاہلیت کی ایسی سزاؤں کا کیا جواز کہ ہاتھ کاٹ دیا جائے، کوڑے لگائے جائیں، جان سے مار دیا جائے۔ ان سزاؤں سے انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔''

تمہید

انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ انسان بسا اوقات کوئی جرم کرنے سے صرف اُس وقت بچتا ہے جب اسے کسی نقصان یا سزا کا خوف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ معاشرت اور دنیا کا انتظام چلانے میں انسانی تاریخ کبھی سزا کے اہتمام سے خالی نہیں رہی۔ جرم کی نوعیت اور شدت کی مناسبت سے ہی سزا کی نوعیت، شدت اور مقدار کا تعین ہوتا رہا ہے۔ لیکن دورِ جدید میں ''حقوقِ انسانی تحریکات و تنظیمات'' نے ''جرم و سزا'' کے اس معروف و معقول تناسب کو بگاڑ کر رکھ دیا اور اسلامی شریعت... جس نے اس تناسب کو برقرار رکھا... پر 'شدت پسندی' کا اعتراض والزام وارد کر دیا۔

اسلامی سزائیں

اسلامی شریعت کی سزائیں مختصراً درج ذیل ہیں، جنھیں بے رحمی و بربریت اور انسانی حقوق کی پامالی کہا جاتا ہے:

(۱) چوری کی سزا 'ہاتھ کاٹ دینا'۔

(۲) زنا کی سزا 'کوڑے مارنا' یا جان سے مار ڈالنا (جیسا جرم ہو اسی کے مطابق)۔

(۳) زنا کا الزام (جسے گواہوں کے ذریعہ ثابت نہ کیا جا سکے) لگانے والے کو کوڑے مارنے کی سزا۔

(۴) قاتل کو 'سزائے موت'۔

موجودہ معاشرہ اسلامی نہیں، بلکہ خود انسانوں کا بنایا ہوا سیکولر معاشرہ ہے، جہاں اخلاق و کردار کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، بلکہ اس پر مادہ پرستی اور بے راہ روی کا غلبہ ہے۔ ایسے سماج میں مندرجہ بالا سزائیں، یقیناً ظلم و بربریت پر مبنی کہی جاسکتی ہیں۔

اسلام پہلے ایک ایسا معاشرہ، اجتماعی نظام اور تمدن بناتا ہے، جس میں اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور آخرت میں جواب دہی کا تصور واضح ہو۔ اس میں چوری، زنا کاری، قتل، فساد، ڈاکہ وغیرہ کے مواقع کو اسلام تعلیم و تذکیر کے ذریعہ کم کرتے ہوئے انتہائی نچلی سطح پر لے آتا ہے، بلکہ کچھ معاملات میں صفر کی سطح پر۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص (مرد یا عورت) جرم کرتا ہے تو اسلام اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ شخص معاشرے کا کینسر اور زہر ہے، اسے اگر معاشرے سے ختم نہ کیا گیا تو وہ معاشرے اور اس کی صحت کے لیے جان لیوا اور مضر ہوگا۔ اس طرح اسلام ایک یا چند ایسے کینسروں سے معاشرے کو نجات دلانے کے لیے سخت ترین سزاؤں کا نفاذ کرتا ہے۔

چوری کی سزا

اسلامی ریاست حقیقتاً فلاحی ریاست ہوتی ہے، (نہ کہ ان سیکولر ڈیموکریٹک ریاستوں کی طرح، جو فلاحی ہونے کا دعویٰ اور پروپیگنڈہ کرتی ہیں، لیکن ان کے زیرِ سایہ لاکھوں کروڑوں غریب، بے سہارا، زندگی کے ساز و سامان سے محروم لوگ دو روٹی کو ترستے، بھوکوں مرتے اور علاج کرانے میں ناکام رہتے ہیں، حتیٰ کہ خودکشی تک کر لینے پر مجبور ہوتے ہیں)۔ اسلامی (فلاحی) ریاست میں یہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اپنے کسی بھی شہری کو اس کی بنیادی ضرورتوں سے محروم نہ رہنے دے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص چوری کرے تو ظاہر ہے کہ وہ چوری کے لیے مجبور نہیں تھا۔ اس وقت اسلام ایسے شخص پر اپنا قانون نافذ کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (المائدۃ:۳۸)

''اور چور خواہ عورت ہو یا مرد، عورتوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی جانب سے عبرت آموز سزا۔''

پہلی چوری کرنے پر دایاں ہاتھ اور دوبارہ چوری کرنے پر بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسلامی شریعت میں تفصیل بتائی گئی ہے کہ کیسی چیزوں کی (کتنی مقدار) میں چوری پر یہ سزا نہیں دی

جائے گی اور کب نہیں دی جائے گی؟ ایسا نہیں ہے کہ چوری ہوئی اور ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ حضرت محمد ﷺ کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایک بار اتنا زبردست قحط پڑا کہ ملک اور معاشرے کی اقتصادی حالت ابتر ہوگئی۔ ایک شخص نے چوری کی۔ یہ ثابت ہوجانے پر کہ اس نے انتہائی مجبوری کی حالت میں ایسا کیا تھا، حضرت عمرؓ نے عارضی مدت کے لیے چوری کی سزا (ہاتھ کاٹ دینا) معطل کردی تھی۔ عام حالات میں چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا دے کر اسلام نے فرد اور معاشرے کو بدامنی سے اور انتظامیہ وعدلیہ کو جرائم کے بھاری بوجھ سے بچالیا۔

زنا کی سزا

اسلام نے اپنے نظامِ پردہ کے ذریعہ اور مرد وعورت کے بے روک ٹوک آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کرکے زنا بالرضا اور زنا بالجبر کا دروازہ تقریباً بند کردیا اور اس کے امکانات بہت ہی کم کردیے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص (مرد یا عورت) اس دروازے کو توڑ کر خانۂ جرم میں داخل ہوجائے اور زنا کا ارتکاب کرگزرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسان نہیں، شیطان ہے اور اسے سخت ترین سزا دے کر معاشرے کو اس کی شیطنت اور اس کے مختلف برے نتائج سے بچانے کا انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ ایسے شخص پر اسلام قانون نافذ کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِأَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُم بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○ (النور:۲)

''زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو (۱۰۰) کوڑے مارو۔ اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو نہ ستائے اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت ایمان والوں کا مجمع وہاں موجود رہے۔''

اسلام میں سرِ عام سزا دینے کی بات اس لیے ہے کہ معاشرے میں اگر کچھ برے عناصر ہوں تو وہ ڈر جائیں اور ایسا برا کام کرنے کی ہمت نہ کریں۔

موجودہ سیکولر قانون طرفین کی مرضی سے کی گئی زنا کاری (زنا بالرضا) کو قابلِ سزا جرم نہیں تسلیم کرتا (بلکہ افسوس ہے کہ اسے انفرادی آزادی اور 'حقوقِ انسانی' مانتا ہے)۔ یہ سوچا بھی نہیں جاتا کہ طرفین کی مرضی سے کی گئی زنا کاری یہیں نہیں رکی رہتی، بلکہ موقع دستیاب ہوجائے

تو زنا بالجبر کے اگلے مرحلے میں بھی مردوں کے قدم رکھے بغیر اس کا اختتام نہیں ہوتا۔ اسلام نے یہ حماقت نہیں کی ہے کہ زنا بالرضا کو اخلاقی یا قانونی جرم نہ قرار دے، البتہ انسانی کم زوری کا اتنا خیال ضرور رکھا ہے کہ غیر شادی شدہ (ایک یا دونوں فریق) کو اسّی اسّی کوڑے مارنے کی اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں بھی زنا کرنے والے کو سنگ سار کرنے کی سزا مقرر کی ہے۔ اس سے زنا کو کم سے کم کی سطح سے صفر کی سطح پر لانا مقصود ہے۔

زنا کے غیر ثابت کردہ الزام کی سزا

اسلام کی نظر میں کسی کی کردار کشی اور کسی کو بلاوجہ بدنام کرنا بڑا گناہ ہے۔ خصوصاً باعصمت خواتین پر زنا کا جھوٹا الزام لگانا گناہ عظیم اور قانوناً جرم بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○

(النور: ۴، ۵)

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی گناہ گار ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔''

اگر کسی زانی کے فعلِ زنا پر چار گواہ نہ ہوں تو قانون تو اسے سزا نہیں دے گا، لیکن اس کا صاف چھوٹ جانا یہ مطلب ہرگز نہیں رکھتا کہ اس جرم کی کوئی سزا ہی نہ تھی۔ آخرت کی زندگی میں یہاں کے گناہوں اور جرائم کی پوری سزا ملنی اللہ کے عادل ہونے کا تقاضا ہے۔ زانیہ اور زانی کو دوزخ کی سخت اور اذیت ناک سزا مل کر رہے گی۔

قتلِ ناحق کی سزا

سیکولر نظامِ قانون میں 'حقوقِ انسانی' کی بنیاد پر (کچھ بہت خاص معاملات کو چھوڑ کر) عموماً سزائے موت نہیں دی جاتی۔ یہ قانون براہِ راست اور حیرت انگیز طور پر قاتل سے بڑی حد تک ہمدردی اور رحم کے حق میں ہے۔ اور جس کا قتل ہوا ہے اس کے اہلِ خانہ (والدین، اولاد، بیوی، خاندان وغیرہ) کے جذبات، ان کے مصائب و مسائل اور ان کی معاشی دشواریوں سے بے

نیاز اور لاپرواہ ہے۔ قاتل کا حقِ انسانی عزیز ہو جاتا ہے، لیکن متاثرہ خاندان کے حقوقِ انسانی اور اس کے گھر کے اندر بلکتے، تڑپتے اہلِ خانہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ قاتل کچھ مدّت بعد جیل سے رہا ہو کر معمول کی زندگی گزارتا ہے اور متاثرہ خاندان کو رنج و غم، یتیمی و بیوگی اور کچھ معاملوں میں معاشی تباہی و بربادی وغیرہ کی مار کھانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر روز مرّہ ہزاروں قتل ہوتے ہیں، دشمنی، فساد اور بدامنی سے گھر، خاندان اور سماج بری طرح متاثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اسلام ایسی صورتِ حال کو نہ برداشت کرتا ہے، نہ اس کو پنپنے کا موقع دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ○ (النور:۱۷۸،۱۷۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے لیے قتل کے مقدمات میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے (یعنی فرض کر دیا گیا ہے)۔ آزاد شخص نے قتل کیا ہو تو اس آزاد شخص سے ہی بدلہ لیا جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے۔ عورت نے قتل کیا ہو تو اس عورت سے بدلہ لو۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی (یعنی مقتول کا کوئی ولی جو انسانی رشتہ سے بھائی ہی ہے) کچھ نرمی کے لیے تیار ہو تو عام اصول کے مطابق خون کے مالی بدلے ('خوں بہا' کی رقم) کا معاملہ طے ہونا چاہیے اور قاتل کے لیے ضروری ہے کہ بھلے طریقے سے خوں بہا چکا دے۔ عقل و فہم والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ توقع ہے کہ تم اس قانون کی نافرمانی سے بچو گے۔''

قرآن نے قتل کی سزا قتل کو زندگی کہا ہے، کیوں کہ اس سے مستقبل میں ممکنہ طور پر قتل ہونے والی بہت سی زندگیاں بچ جاتی ہیں، لہٰذا اسے بربریت اور ظلم کہنا درست نہیں ہے۔ یہ قانونِ سزا تو انسانوں کے لیے خدائے رحمان و رحیم کی رحمت کا مظہر ہے۔ وہ رحمت، جس کے ذریعہ اللہ فرد اور معاشرے کو قتل جیسے جرم اور اس کے غیر معمولی نقصانات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

قاتل کو قتل کی سزا نہ دیے جانے کی دلیل

قاتل کو قتل کی سزا نہ دیے جانے کی دلیل کے طور پر اس کے اپنے اہلِ خانہ کا کفیل (Sole

(Bread Winner) ہونے کا حوالہ دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک شخص کے جرم کی سزا اس کے بے قصور خاندان کو کیوں دی جائے؟ اس سلسلے میں دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ جائز یا ناجائز ایک خون تو ہو گیا، اب قاتل کو بھی قتل کر دینا ایک مزید قتل ہے۔ کیا حکومت اور ریاست کو بھی قتل و خون کرنا چاہیے؟ ایسا فعل، جو کسی شخص (قاتل) کے لیے غلط ہے، ایک ریاست (State) کے لیے حق بجانب کیسے ہو سکتا ہے؟ پہلے اشکال سے متعلق اسلامی موقف یہ ہے کہ قاتل کے اہلِ خانہ کے حقوقِ انسانی ایسے غیر محدود، غیر مشروط اور دائمی قرار نہیں دیے جا سکتے کہ سماج کے دوسرے افراد اور ان کے خاندانوں کے انسانی، معاشرتی و معاشی حقوق کی قیمت ادا کر کے ان کے (یعنی قاتل کے اہلِ خاندان کے) حقوق کو لازماً یقینی بنایا جائے۔ پھر اسلامی قانونِ سزا اگر نافذ ہو تو خود یہ خیال ہی قاتل کو قتل کے عمل سے باز رکھنے کا مضبوط سبب (Deterrent) بن سکتا ہے کہ اسے قتل کی سزا 'موت' مل جانے پر اس کے بے قصور اہلِ خانہ شدید ذہنی اور معاشی یا سماجی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اسلام کا اس ضمن میں تیسرا موقف یہ ہے کہ اس دنیا کا نظامِ عدل و قانون و سزا صد فیصد اَچوک (Perfect) نہیں ہو سکتا اور انسان کی محدود زندگی کی وجہ سے غیر مکمل اور ناقص ہے۔ اس محدود و ناقص عرصۂ حیات و نظامِ حیاتِ انسانی میں اس تلخ حقیقت سے مکمل نجات یا فرار ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص کی غلطی یا جرم کی سزا سے اس کے لیے قصور اہل و عیال یا والدین لوگ بھی کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوں گے۔ لہٰذا اسلام کہتا ہے کہ ایسی بے عیب و بے نقص زندگی تو آخرت میں ہی عطا کی جائے گی۔ اس اُخروی زندگی میں ہی یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے عمل بد یا جرم کا خمیازہ صرف وہی شخص بھگتے اور اس کے بے قصور متعلقین اس سے قطعاً متاثر نہ ہوں۔ دنیوی زندگی بہ جائے خود مکمل نہیں ہے، بلکہ اُخروی زندگی اس کا تکملہ ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ قاتل کو قتل کی سزا (موت) دینے سے آئندہ قتل و خون کی پیش بندی ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ سزا کا بنیادی لازمہ ہے کہ وہ جرم کی شدت و نوعیت کی مطابقت و مناسبت میں ہو، ورنہ پھر تقاضائے انصاف و عدل پامال ہوگا۔

ꕥ

باب:۸

مسلم پرسنل لا: علیحدگی پسندی؟

''ہندوستان کے مسلمان اپنے لیے علیحدہ پرسنل لا ہونے پر اصرار کیوں کرتے ہیں؟ تمام ہندوستانی شہریوں کے لیے یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے۔ یہ ملک کے اتحاد اور سالمیت کا تقاضا ہے اور تمام شہریوں کے، قانون کی نظر میں برابر ہونے کا تقاضا بھی۔ آئین بھی یہی چاہتا ہے۔''

تمہید

کہا جاتا ہے کہ جب ملک ایک ہے دستور ایک ہے، تو تمام شہریوں کے لیے سارے قوانین ایک جیسے ہونے چاہئیں اسی میں ملک کے اتحاد و یک جہتی کا راز پنہاں ہے۔ اس کے خلاف ہوا تو ملک ٹوٹ جائے گا۔ اس مغالطہ/ اعتراض کا رخ ہمیشہ مسلمانانِ ہند اور اُن کے عائلی قوانین (پرسنل لا) کی طرف ہوتا ہے۔

اس غلط فہمی اور اعتراض کے تین پہلو ہیں:

(۱) ہندوستانی آئین میں یکساں سول کوڈ کی بات کا موجود ہونا۔

(۲) یکساں سول کوڈ نافذ نہ ہونے سے ملک کے اتحاد و سالمیت کو خطرہ لاحق ہونا۔

(۳) مسلمانوں کی اپنے لیے الگ پرسنل لا کی ضد۔

۱- ہندوستان کے آئین میں یکساں سول کوڈ کا بیان

یہ صحیح ہے کہ آئین میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ لیکن یہ بات اس کے دیباچہ (Preamble) میں کہی گئی ہے نہ کہ اصل آئین میں۔ اصل آئین کی دفعات (1) 25 اور (B)26 کے تحت جو بات کہی گئی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر مذہبی طبقے کو اس کا اختیار حاصل

ہوگا کہ اپنے مذہب پر چلے اور اپنے طور پر اپنے مذہبی اعمال انجام دے۔ لہٰذا یہ صرف مسلمانوں (یا دیگر اقلیتی طبقوں) کا معاملہ ہی نہیں، بلکہ آئینی دفعات اور اکثریتی طبقے کے آئینی حقوق کا بھی تقاضا ہے کہ اس کے تحت ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ نہ ہو۔

۲- ملک کے اتحاد و سالمیت کا سوال

اگر برائے بحث ہی یہ مان لیا جائے کہ مسلمانوں کے علیحدہ پرسنل لا سے ملک کے اتحاد و سالمیت کو خطرہ ہے تو پھر مسلمانوں سے زیادہ اُن دانش مند شخصیتوں اور ملک کے خیر خواہوں پر اس شبہے یا الزام کی زد پڑ جاتی ہے جنھوں نے دنیا کا بہترین آئین سمجھا جانے والا آئین (دستور) بنایا اور اس میں دفعات 25(1) اور 26(B) کو شامل کیا تھا۔

اگر مسلم طبقہ فوج داری قوانین کی دفعات کو مانتا ہے (اور فوج داری کے معاملے میں دوسرا فریق غیر مسلم بھی ہوسکتا ہے) اور دیوانی معاملوں میں سے انفرادی، گھریلو اور خاندانی معاملوں کو چھوڑ کر (جس میں دوسرا فریق غیر مسلم نہیں ہوسکتا) اکثر میں ہر شہری پر نافذ قوانین پر بھی عمل کرتا ہے تو پھر کچھ تھوڑے سے دیوانی معاملوں (جیسے نکاح طلاق وغیرہ) میں علیحدہ قانون پر چلنے سے ملک کے اتحاد و سالمیت کا خطرے میں پڑ جانا نا قابلِ فہم اور ایک بے دلیل بات ہے۔ پینسٹھ (۶۵) سال سے تو ایسا کوئی خطرہ آیا نہیں، ورنہ اگر شبہے اور الزام میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو اب تک وہ خطرہ کبھی نہ کبھی تھوڑا بہت ہی سہی سامنے آجانا چاہیے تھا، اور ملک کے کچھ چھوٹے بڑے ٹکڑے ہوجانا چاہیے تھے۔ جب کہ یہ پینسٹھ (۶۵) سال گواہ ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ملک کی تعمیر، ترقی اور اتحاد و سالمیت میں کسی بھی (اقلیتی یا اکثریتی) طبقے سے کم یا فروتر تعاون (جہاں تک انھیں موقع ملا، یا دیا گیا) نہیں دیا ہے۔ بھلا اس بات سے ملک کے اتحاد و سالمیت کا کیا تعلق کہ ایک طبقہ اپنے ازدواجی یا خاندانی معاملات دوسروں سے الگ طریقے سے چلاتا ہے۔

اتحاد تو اس وقت متاثر ہوگا اور سالمیت کو اس وقت خطرہ لاحق ہوجائے گا جب مختلف طبقات کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے ایسے مذہبی اصولوں اور تعلیمات کو بھی ترک کردیں جن سے دوسری مذہبی اقوام کا کوئی راست اور لازمی تعلق نہیں ہے۔ پھر یہ بات مسلمانوں یا دیگر اقلیتوں تک ہی محدود نہیں رہ جائے گی، بلکہ خود وہ معاشرہ، جسے اکثریتی سماج کہا جاتا ہے اور جس میں ذات

برادری پر مبنی سیکڑوں ذیلی درذیلی طبقے ہیں، آپس ہی میں الجھ کر، بدامنی وکش مکش اور انتشار کا شکار ہوکر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یکساں سول کوڈ کی بات کرنے والے لوگ بھی یہ بات قبول کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کوئی یکساں سول کوڈ ممکن اور قابلِ عمل ہے ہی نہیں۔

(۳) مسلمانوں کا اصرار

مسلم پرسنل لا پر مسلمانوں کے اصرار کی وجوہ خاص طور سے دو ہیں:

اوّل: نکاح، طلاق وغیرہ کے قانون ان کے اپنے بنائے ہوئے نہیں ہیں (کہ اپنی مرضی سے وہ ان سے دست بردار ہو سکتے ہوں)، بلکہ یہ قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ شریعت کا بنیادی خاکہ اللہ کا بنایا ہوا اور اس کی تفصیل بھی اللہ کی رہ نمائی میں اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ طے کی گئی ہے۔ کسی مسلمان عالم وفقیہ کو یا اجتماعی طور پر دنیا کے تمام مسلمانوں کو بھی اس بنیادی خاکے میں اور اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ بتائی گئی تفصیلات میں تبدیلی یا کمی بیشی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ (وقت اور ضرورت کے مطابق) ان قوانین کی توضیح وتشریح صرف اس دائرے کے اندر رہ کر ہی کی جاسکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ نے متعین کردی ہے۔ اس دائرے سے تجاوز کرتے ہی اسلام ترک ہوجائے گا اور مسلم امت اسلام کے دائرے سے خارج ہوجائے گی۔ اسلام کی حقیقت، اسلام اور مسلمانوں کے مابین تعلق اور مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی شریعت کے اس کردار سے بخوبی واقف نہ ہونے کی وجہ سے برادرانِ وطن کو یہ الجھن اکثر وبیش تر پیش آتی ہے کہ آخر مسلمانانِ ہند اپنے لیے علیحدہ پرسنل لا پر اس قدر اصرار اور یکساں سول کوڈ کی مخالفت کیوں کرتے ہیں!

دوم: کسی بھی صاحبِ عقل ہندوستانی شہری کی طرح مسلمانوں کو بھی یہ یقین ہے کہ مسلمانانِ ہند کے پرسنل لا سے نہ تو علاحدگی پسندی کا کوئی تعلق ہے نہ اس سے ملک کے اتحاد و سالمیت کو خطرہ ہونے میں ذرہ برابر بھی سچائی ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس موضوع کو محض سیاسی مفاد (ووٹوں کے ارتکاز) کے لیے کچھ کچھ برسوں بعد چھیڑ دیا جاتا ہے۔ اسے چھیڑنے والے لوگ بھی یکساں سول کوڈ کے قابلِ نفاذ وقابلِ عمل ہونے کا انکار کرتے رہے ہیں۔

ꕥ

باب:۹

وحدتِ ادیان کیوں نہیں؟

(سرودھرم سمبھاؤ)

''تمام مذاہب اچھائی کی تعلیمات دیتے ہیں، سب ایک ہی لافانی ہستی کی بات کرتے ہیں، خواہ ان کے نام الگ ہوں۔ یعنی- ایشور، خدا، اللہ، گاڈ وغیرہ۔ تمام مذاہب کی منزل ایک ہی ہے چاہے راستے الگ الگ ہوں۔ اس طرح تمام مذاہب برحق ہیں، برابر ہیں۔ پھر اسلام محض خود کو ہی 'دینِ حق' کیوں کہتا ہے؟ کثرت میں وحدت کا حامی کیوں نہیں ہے؟''

تمہید

مندرجہ بالا خیال اور اس سے پیدا ہونے والا سوال مذہب کی حقیقت نہ جاننے اور اسلام کے بارے میں براہِ رست علم نہ ہونے، مطالعے کی کمی اور سطحی جان کاری کا نتیجہ ہے۔ موجودہ دور علم و سائنس اور دلائل و ثبوت کا زمانہ ہے، کسی موضوع کی تہہ تک جا کر اس کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کو سمجھنے کا زمانہ ہے، جس میں ہر شخص کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی رائے بنانے اور موقف اختیار کرنے کے لیے اپنی عقل و فہم اور فکری صلاحیت کا ممکنہ حد تک مکمل استعمال کرتا ہے۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ مذہب جیسے اہم موضوع پر وہ عموماً بڑی لاپروائی اور غیر سنجیدگی سے کام لیتا ہے اور اسی عدمِ واقفیت میں کوئی رائے قائم کر کے اس پر جم جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی تشہیر و تبلیغ کے ساتھ اس پر اصرار بھی کرنے لگتا ہے۔ وحدتِ ادیان کا تصور بھی اسی طریقۂ فکر کا نتیجہ ہے۔ آئندہ سطور میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے اس کی حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہاں اس سوال کا جواب بھی سامنے آجائے گا کہ اسلام صرف خود کو ہی واحد دینِ حق کیوں کہتا ہے؟ اس کے دلائل کیا ہیں؟ اور وہ کتنے فطری اور معقول ہیں؟

مذہب

مذہب بنیادی انسانی اقدار (Basic Human Values) اور ان کی حامل اچھی تعلیمات سے آگے کی چیز ہے۔ اعلیٰ اوصاف، مثلاً نیکی، بھلائی، سچ بولنا، جھوٹ سے اجتناب، دوسروں کی مدد کرنا، ضرورت مندوں کے کام آنا، دکھ درد میں شامل ہونا غریبوں اور کم زوروں کا تعاون کرنا وغیرہ ہر شخص کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے، چاہے وہ شخص کسی مذہب کا ماننے والا ہو یا بے دین اور ملحد ہو۔ مذہب ان اوصاف کی تعلیم کے ساتھ انھیں اہمیت بھی دیتا ہے، نیز انسانی معاشرے میں انھیں قائم کرنے اور فروغ دینے پر پورا زور بھی دیتا ہے۔ لیکن صرف ان اوصاف پر اس کی بنیاد نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کن موقف متعین کرتے وقت مذہب کے بنیادی عنصر کو سامنے رکھنا ہوگا۔

مذہب کیا ہے؟

مذہب اپنی مروّجہ اصطلاح میں دراصل عقیدہ و اعمال کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اللہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے مذہب میں اللہ پر یقین کرتے ہی اس سے متعلق کچھ اور باتوں پر یقین کرنا لازمی ہوجاتا ہے۔ جیسے اس کے خالق، مالک، معبود، حاکم، رب وغیرہ ہونے پر یقین۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بے شمار صفات اور قوتوں پر بھی یقین خود بخود لازمی ہوجاتا ہے۔ یہاں سے بات اور آگے بڑھتی ہے۔ اللہ کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ہم سے اپنی عبادت کیوں اور کیسے کرانا چاہتا ہے؟ ہمارے لیے ہماری زندگی سے متعلق اس کے احکام وفرامین، اصول وضوابط، جہات وحدود، اس کی فرماں برداری کے طریقے وغیرہ کیا ہیں؟ یعنی ہمارے اور خدا کے درمیان گہرے تعلقات کی صورت اور اس کا دائرہ کیا ہے؟ ان بنیادی واہم سوالات کا جواب پانے کے لیے ہمیں خود اللہ کی جانب سے ایک ہدایت نامے وحکم نامے کی ضرورت ہے، جسے کلامِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہاں سے بات تھوڑی اور آگے بڑھ کر اس بات کو لازمی بنا دیتی ہے کہ پھر انسان اور خدا کے درمیان کوئی قابلِ یقین اور معتبر وسیلہ بھی ہو (جسے الگ الگ زبانوں میں پیغمبر، نبی، رسول، رشی، پروفٹ وغیرہ کہا جاتا ہے)۔ اس کے ساتھ ہی یہ جاننا بھی ضروری قرار پاتا ہے کہ مذہب کا بنیادی عقیدہ کیا ہے؟ اس بنیادی عقیدے کے تحت اور کون سے ذیلی عقیدے آتے ہیں؟ ان ذیلی عقیدوں سے کون سا دائرہ بنتا ہے جو مذہب کے حدود کا تعین کرتا ہے، ان کے اندر رہ کر انسان

مذہب کا ماننے والا بنتا ہے اور ان سے باہر نکل جانے پر مذہب سے خارج اور بے دین ہو جاتا ہے۔ مذہب اگر واقعتاً سچا مذہب ہے، ازلی و ابدی ہے، سب کے لیے قابلِ قبول ہے اور مندرجہ بالا تمام اوصاف اس میں موجود ہیں تبھی اسے انسانوں کا مذہب ہونے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

کیا سارے مذاہب یکساں ہیں؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قبل کچھ اہم باتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ جب اللہ صرف ایک ہے۔ تمام جان دار اور بے جان اشیاء کی تخلیق اسی ایک اللہ نے کی ہے، یہ تخلیق اور کائنات (جس کا انسان ایک جز ہے) اسی ایک اللہ کی قوت و اقتدار کے تحت ہے۔ انسانوں کی جسمانی بناوٹ ایک جیسی ہے، بدی و برائی کا تصور بھی تمام انسانوں میں ایک ہے اور اچھائی و نیکی کا تصور بھی ایک، حق ایک ہے جو لافانی اور ناقابلِ تغیر ہے، تو پھر مذاہب الگ الگ کیوں ہوں؟ جب دنیا کی بڑی بڑی حقیقتیں جن کا براہِ راست یا بالواسطہ تعلق انسان سے ہے ایک ہی ہیں تو پھر انسانوں کے لیے مذہب کا مختلف ہونا نہ مدلل ہے نہ معقول۔ دل و دماغ اس بات کو قبول نہیں کرتے۔

اسلام کا موقف

اسلام اس الجھن کو بڑی آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ اس کے مطابق مذہب صرف ایک ہی ہے۔ مذہب ازلی و ابدی سچائی ہے۔ سچائی چوں کہ ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے نہ کہ متضاد، لہٰذا مذہب ہمیشہ سے ایک ہی تھا، ایک ہی رہے گا، خواہ اسے مختلف زمانوں اور زبانوں میں مختلف الفاظ اور ناموں سے جانا گیا ہو، لیکن ایک سے زیادہ الفاظ کا استعمال ہونے سے مذہب ایک سے زیادہ نہیں ہو جاتے۔ حق میں تضاد ممکن نہیں۔ لہٰذا جس میں تضاد ہو وہ دینِ حق نہیں ہو سکتا۔ اگر مذہب بہت سے بن جائیں یا بنا لیے جائیں اور سب کے بنیادی عقائد بھی باہم مختلف ہوں اور اُن میں داخلی تضادات بھی ہوں تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ سبھی سچے اور برابر ہوں۔ اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے میں اس معاملے پر ایک معروضی (Objective) نظر ڈالنا مفید ہوگا۔

'مذاہب' کے بنیادی عقائد میں تضاد

مذہب کا کئی مذاہب کی شکل اختیار کر لینا ہی مذاہب میں عدمِ مساوات کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ عدمِ مساوات اور تضادات جب بنیادی عقائد، اصول، قوانین اور تعلیمات میں واضح

طور پر پائے جاتے ہوں اور اپنے ماننے والوں پر گہرے اثرات ڈالتے ہوں تو معاشرے میں اختلافات کی ایسی مضبوط بنیادیں پڑ جاتی ہیں کہ ''تمام مذاہب یکساں ہیں''، محض ایک خوش خیالی اور ایک نعرہ تو بن سکتا ہے، عملی شکل اختیار نہیں کرسکتا۔ ایسے کچھ تضادات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

مذاہب میں عدمِ مساوات — ایک حقیقت

☆ کوئی مذہب یہ کہے کہ معبود صرف 'ایک خدا' ہے اور دوسرا مذہب کہے کہ نہیں دو معبود اور بھی ہیں۔

☆ معبود ہونے میں 'ایک' اور 'تین' تک میں بات محدود نہ رہ جائے بلکہ کوئی تیسرا مذہب کہے کہ معبود تو سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ہیں۔

☆ ایک مذہب کہے کہ خدا نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ دوسرا مذہب کہے کہ خدا کا ایک بیٹا بھی ہے۔ بیٹا ہونے کے ناتے وہ خدائی میں اس کا شریک بھی ہے، جب کہ پہلا مذہب کہے کہ خدا کی خدائی میں کوئی شریک نہیں ہے۔

☆ ایک مذہب کہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کر کے زندگی بسر کرنے والا شخص مرنے کے بعد جنت میں جائے گا اور اس کے برعکس کردار کا شخص جہنم میں۔ دوسرا مذہب کہے کہ نہیں فلاں ہستی کو خدا کا بیٹا ان مان لینے سے ہی آدمی جنت میں چلا جائے گا، خواہ اس نے کتنے ہی گناہ، ناانصافی، ظلم، جرائم اور بدکاریاں کی ہوں۔

☆ ایک مذہب کہے کہ قابلِ پرستش ہستی صرف خدا کی ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ دوسرا مذہب کہے: نہیں والدین بھی قابلِ پرستش ہیں، استاد بھی قابلِ پرستش ہیں، زمین بھی، ندی، پہاڑ، سورج، جانور، پیڑ، سانپ بھی قابلِ پرستش اور رشی منی، گرو، عظیم شخصیات، مذہبی رہنما سب قابلِ پرستش ہیں، یہاں تک کہ کام کرنے کے اوزار بھی قابلِ پرستش ہیں اور جنسی اعضاء بھی۔ ملک و وطن بھی قابلِ پرستش ہے۔

☆ ایک مذہب کہے: اگر کوئی مرد کسی غیر عورت کے جسم کو شہوانی جذبے سے مس بھی کردے تو وہ آخرت میں جہنم کا عذاب اور اذیت جھیلے گا۔ دوسرا مذہب کہے کہ زوجین کو اگر بیٹا نہ پیدا ہو تو شوہر اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے پاس نرینہ اولاد کے حصول کے لیے بھیج سکتا

ہے۔غیر مرد اس کی بیوی سے حاملہ ہونے تک جماع کرے، اور اس ناجائز فعل کو معاشرتی اور اخلاقی قبولیت بھی حاصل ہو۔

☆ ایک مذہب شراب، جوا وغیرہ کو ناجائز وحرام قرار دے، دوسرے مذہب میں جوا وشراب جائز ہو۔

☆ ایک مذہب کہے کہ خدا غیر مجسم ہے۔وہ کبھی کسی وجہ اور مقصد سے بھی، کسی طرح کی شکل یا جسم اختیار نہیں کرتا۔انسانوں کی ہدایت کے لیے وہ انسانوں میں سے ہی کسی کو منتخب کرتا اور اسے اپنا رسول پیغمبر نبی مقرر کرتا ہے۔دوسرا مذہب کہے کہ وہ پیغمبر، نبی، عظیم شخصیت (رشی) مجسم شکل میں خود خدا ہوتا ہے، جو انسانی جسم اختیار کر کے دھرتی پر آیا کرتا ہے۔

☆ ایک مذہب کہے کہ مرنے کے بعد جنت وجہنم ہے اور پنرجنم (دوبارہ دنیوی زندگی) اور آواگمن بھی ہے، یعنی لگاتار و مسلسل آمد ورفت-زندگی سے موت کی طرف اور موت سے زندگی کی طرف۔(جبکہ دونوں عقائد ایک دوسرے کے متضاد بھی ہوں) اور دوسرا مذہب کہے کہ موت کے بعد دوبارہ دنیوی زندگی نہیں، بلکہ صرف اخروی زندگی ہوگی۔آخرت میں یہ دوبارہ زندگی یا تو جنت میں بسر ہوگی یا جہنم میں۔دنیا میں واپسی نہ ہوگی۔

☆ ایک مذہب کہے کہ تمام انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں، ان میں کوئی بھی شخص پیدائشی یا نسلی، اونچا نیچا اور اعلیٰ ادنیٰ نہیں ہے۔دوسرا مذہب کہے کہ نہیں، انسانوں میں پیدائشی نسلی اونچ نیچ ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

☆ ایک مذہب کہے کہ اس کی بنیادی کتاب خالص اور مکمل اللہ کی کتاب ہے، دوسرا مذہب کہے کہ اس کی کتاب انسانوں کی بنائی ہوئی ہے یا انسانی مداخلت اور ترمیم وتبدیلی سے پاک نہیں ہے، پھر بھی وہ کتابِ الٰہی ہے۔تیسرا مذہب کہے کہ اس کی مذہبی کتابوں کے الٰہی ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔کون سی کتاب یا کتابیں مذہب کی بنیادی کتاب یا کتابیں ہیں، یہ بھی متفقہ طور پر متعین نہیں۔اور صورتِ واقعہ یہ ہو کہ سبھوں میں آپس میں بھی تضاد ہو اور ان میں سے کچھ کتابوں میں اندرونی تضاد بھی۔

مندرجہ بالا فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے، لیکن مختصر فہرست سے بھی یہ سچائی واضح اور یقینی طور پر سامنے آجاتی ہے کہ اتنے اختلافات، فرق اور تضادات کے ہوتے ہوئے تمام مذاہب نہ

برابر ہو سکتے ہیں، نہ ایک ہی منزل پر اپنے ماننے والوں کو پہنچا سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک ہی دین حق ہے۔

دینِ حق کی تلاش

سارے مذاہب برابر اور سچے ہیں یا نہیں؟ اس تذبذب سے نکلنے اور اس الجھن کے حل ہونے کے بعد انسانوں کے سامنے صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔ اس بات کی تلاش کہ دینِ حق ہے کون سا؟ لیکن اس تلاش کی بنیاد کیا ہو، جو تمام انسانوں کے لیے اطمینان بخش ہو؟ اس کی ایک بنیاد ہے، جو عقل و فہم کو مطمئن بھی کرتی ہے۔

دنیا میں چار بڑے مذاہب رائج ہیں۔ ان سب کی اپنی مذہبی کتب ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے وہ عقائد اور روایات جمع کر لی جائیں، جو سب میں مشترک ہوں۔ یعنی ان میں آپس میں کوئی تضاد نہ ہو۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ کس مذہب کی کتاب ہے، جس میں یہ سارے عقائد و روایات اس طرح موجود ہیں کہ اس میں ان مشترک باتوں کے برخلاف و برعکس کوئی بات نہ ہو۔ وہ مشترک باتیں جو سامنے آئیں گی یہ ہیں:

(۱) 'توحید'، جو خالص ہے، یعنی جس کے مطابق قابلِ پرستش، معبود صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔

(۲) اللہ کی ذات، صفات، حقوق و اختیارات میں کوئی شریک نہیں ہے۔

(۳) 'آخرت'۔ اس عقیدے کے مطابق موت کے بعد زندگی ہے، جس میں اس زندگی کے اعمال کے مطابق یا تو جنت ملے گی یا جہنم۔

اس عمل کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی دینِ حق کی تلاش مکمل ہو جائے گی۔ اس تلاش کا نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ وہ دینِ حق اسلام ہے۔ کیوں کہ یہی مشترکہ باتیں اسلام کے بنیادی صحیفہ 'قرآن' میں درج ہیں اور اس میں ان عقیدوں کے برعکس یا برخلاف کچھ بھی نہیں ہے۔ دیگر مذاہب کی بنیادی کتب میں درج بالا تینوں مشترکہ عقائد کے ساتھ ساتھ ان کے خلاف بھی عقائد پائے جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ان مذاہب کے برحق نہ ہونے کی مضبوط ترین اور ناقابلِ تردید دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام 'تمام مذاہب برحق ہیں' کے غیر حقیقی اور غیر فطری تصور کی تردید اور ایک تذبذب و ابہام کا ازالہ کرتے ہوئے خود کو دینِ حق کہتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ عقل و فہم، دلائل اور جدید تحقیقات کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے اور اطمینان بخش بھی ثابت ہوتا ہے۔ اسلام کا یہ

موقف مطالعہ و تدبر کے سائنٹفک پیمانے کے عین مطابق اور مدلل ہے کہ اتحاد بین المذاہب، وحدتِ ادیان، اور مذاہب میں یکسانیت کا نظریہ مناسب نہیں ہیں، بلکہ مذہب کی وحدت (Oneness) مناسب نقطہ نظر ہے، بالکل ویسے ہی، جیسے کہ وہ اللہ کی وحدت (Oneness of God) اور نوعِ انسانی کی وحدت (Oneness of Humankind) کا حامی وداعی ہے۔

مذہب کو کیسا ہونا چاہیے؟

انسان جسم اور روح کے اشتراک سے وجود میں آتا ہے اور اس کی شخصیت میں یہ دونوں پہلو غیر منقسم ہیں، لہٰذا انسانوں کے لیے درست مذہب ایسا ہونا چاہیے جو اس کی مادّی و دنیوی اور روحانی و اخلاقی زندگی میں توازن برقرار رکھ سکے۔ (اسلام کے سوا) دیگر مذاہب اور انہیں ماننے والی قوموں کی تاریخ یہ بھی ہے کہ مذہب نے پوجا پاٹ، عبادت گاہوں اور کچھ محدود مذہبی رسوم ورواج تک اپنے ماننے والوں کا ساتھ دیا، زیادہ سے زیادہ کچھ انسانی قدروں اور اخلاقی اوصاف کی تعلیم دے کر کچھ تعمیرِ کردار اور خدمتِ خلق میں سرگرم کر دیا۔ اس کے بعد نوعِ انسانی کے عظیم، وسیع، ہمہ جہتی نظامِ حیات میں مذہب نے اپنے ماننے والوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہی بات اس ستم ظریفی کی اصل وجہ بن گئی کہ مذہب کو نظام سے اور نظام کو مذہب سے بالکل ہی علیحدہ کر دیا گیا۔ یہ علیٰحدگی اتنی زبردست اور خطرناک رہی کہ مذہب اور نظام ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن بن گئے۔ لہٰذا نظام کی سطح پر مذہب بیزاری اور لاتعلقی یہاں تک بڑھی کہ عوام کو مذہب دشمنی پر مبنی ایک جدید مذہب 'سیکولرزم' ایجاد کرنا پڑا۔ اس نئے مذہب نے بلند آواز میں کہا کہ خدائی مذہب کو اجتماعی زندگی (سیاست، عدلیہ، انتظامیہ، حکومت، معاشی نظام، نظامِ تعلیم وغیرہ) سے باہر نکال کر نئے مذہب (سیکولرزم) کا اختیار واقتدار قائم ہونا چاہیے۔ اس طرح مذاہب کے اختلاف کی وجہ سے اور ان کی کمزوریوں کے نتیجے کے طور پر انسان کی غیر منقسم شخصیت کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سیکولرزم نے نعرہ بلند کیا کہ انفرادی پوجا پاٹ میں خدا کو ماننے والے مذہبی رہنا چاہو تو رہو، لیکن اس دائرے سے باہر نکل کر اجتماعی نظام میں قدم رکھنے سے پہلے خدا اور مذہب کو اپنے گھر میں ہی رکھ آؤ۔

یہ المیہ اس وجہ سے پیش آیا کہ مذہب، جو ایک سے کئی ایک میں بکھر چکا تھا، تضاد کا شکار ہو چکا تھا، برادریوں، نسلوں، ذاتوں، قوموں اور جغرافیائی علاقوں وغیرہ میں تقسیم کیا جا چکا تھا، لہٰذا

وہ اپنی قوی اور مؤثر خصوصیات اور اوصاف کھو چکا تھا۔ اس وجہ سے اسے ہٹا کر اس کی جگہ پر قائم ہو جانے والے خدا بیزار نئے انقلابی مذہب (سیکولرزم) کے آگے اسے گھٹنے ٹیک دینے تھے۔ اس کے انتہائی خطرناک نتائج نوع انسانی کو جھیلنے پڑے اور ہنوز جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ فساد، تشدد، خوں ریزی، استحصال، نا انصافی، ظلم، زنا، نشہ خوری، شراب نوشی، جرم، قتلِ عام، نسل کشی، اباحیت، عریانیت، فحاشی، جنسی جرائم وغیرہ کا سیلاب ہے، جس پر باندھا جانے والا ہر باندھ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسے درست کرنے کی جتنی کوششیں کی جاتی ہیں، انھیں ناکارہ بنا کر یہ سیلاب پہلے سے بھی زیادہ تباہی مچاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ انتشارِ مذہب کی وجہ سے ہوا، یعنی حقیقی واحد مذہب کو لوگوں نے مختلف مصنوعی و اختراعی مذاہب میں توڑ توڑ کر اس کی تعمیری و اصلاحی تاثیر کو ختم کر دیا اور انسان و سماج کو گم راہی میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔

اسلام کا امتیاز

اسلام دیگر مذاہب کی طرح نہیں ہے۔ اس میں وہ کم زوریاں اور نقائص نہیں ہیں جو دیگر مذاہب کے حوالے سے اوپر بیان کی گئی ہیں۔ یہ نہ انسان کو روحانیت و مذہبیت اور مادّیت و دنیاداری کے خانوں میں بانٹتا ہے اور نہ سماج و اجتماعی نظام کو۔ اس میں ہر بات، ہر معاملہ، ہر عمل، ہر شعبۂ حیات خدائی دین میں شامل ہے۔ یہ کسی بھی چھوٹے بڑے معاملے یا مسئلے میں نہ انسان کو تنہا چھوڑ دیتا ہے نہ معاشرے کو بے یار و مددگار اور نہ اجتماعی نظام کو بے سہارا۔ انسان کی مکمل رہنمائی کرنے میں، ہر معاملے اور ہر حالت میں انسانوں کے ساتھ رہنے، ان کا ساتھ دینے، مددگار و معاون بننے میں اور ان کے پیچیدہ مسائل حل کرنے میں ایک (خدائی دین) سچے مذہب کو جتنا بیدار، خبردار، اہل، مستعد اور سرگرم ہونا چاہیے، اسلام ٹھیک ویسا ہی ہے، پھر عقل مندی اور حق پسندی یہ کہنے میں نہیں ہے کہ تمام مذاہب ایک جیسے ہیں۔

عملی تصدیق

اگر یہ بات صرف کہنے کی حد تک ہی نہیں، بلکہ واقعتاً بھی سچ ہوتی کہ تمام مذاہب یکساں طور پر برحق ہیں تو پھر ایسا ہونا چاہیے تھا کہ تبدیلیِ مذہب پر سماج میں اُس بے چینی، غیظ و غضب، تشدد اور فساد انگیزی کا مظاہرہ نہ کیا جاتا جو کسی مذہب کے پیرو کار اپنے کسی ہم مذہب کے تبدیلیِ مذہب پر کیا کرتے ہیں۔ جب ایک شخص حق سے حق ہی کی جانب گام زن اور منتقل ہوتا ہے اور ہر حالت

میں حق کے تحت ہی رہتا ہے تو پھر اس پر غیض وغضب کا کیا جواز ہے؟ اس سے اس سچائی کی عملی تصدیق بھی ہو جاتی ہے کہ وحدتِ ادیان کے حامی لوگ خود بھی یہ مانتے ہیں کہ تمام مذاہب برابر نہیں ہیں۔

آخر میں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلام تمام رائج مذاہب میں یکسانیت ویکجہتی وغیرہ کا غیر فطری موقف اپنانے اور نا قابلِ عمل تعلیم دینے کے بجائے تمام مذہبی گروپوں اور قوموں کے درمیان انسانیت اور انسانی اقدار کی بنیاد پر خیر سگالی، انسانی بھائی چارہ، رواداری، عدل وانصاف، احسان اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کا یہ موقف بالکل واضح، غیر پیچیدہ، شفاف (Transparent) اور مطمئن کن (Convincing) ہے کہ مذہبی اقوام کے درمیان انصاف اور خیر سگالی کی تمام ممکنہ ومعقول نیز عدل پر مبنی شکلوں کا قیام ہونا چاہیے، بلکہ اسلام تو اس خیر سگالی اور انسانی اتحاد کا داعی ہے۔ لیکن یہ بات تو بالکل ہی غیر معقول اور نا قابلِ عمل ہے کہ تمام مختلف، متضاد اور متصادم مذاہب میں بھی خیر سگالی اور اتحاد ہونا چاہیے۔ اگر ایسا کوئی مصنوعی اتحاد بالفرض قائم ہو بھی جائے تو یہ مخلوط انسانی سماج کے لیے نعمت ورحمت کے بجائے زحمت ومصیبت بن کر رہ جائے گا۔



باب: ۱۰

ذبیحہ وقربانی — تشدد، بے رحمی، ہِنسا؟

''اسلام میں گوشت خوری اور اس کے لیے جانوروں کی ہلاکت کا رواج تشدد آمیز اور بے رحمانہ عمل ہے۔ اس سے مسلمانوں میں تشدد پسندی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کی قربانی کے اجتماعی طریقہ میں یہ بے رحمی وسیع شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کیا یہ وہی اسلام ہے جس کا خدا الرحمٰن اور الرحیم ہے؟ یہ کیسی رحمت ہے؟''

تمہید

اس موضوع کے کئی پہلو ہیں۔ ان سب پر نظر ڈالنے سے مذکورہ اعتراضات کے ازالے اور اس سلسلے میں پیش آنے والی الجھنوں کو حل کرنے میں آسانی ہوگی۔

انسانی تاریخ میں گوشت خوری کی روایات ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ جان داروں کو بے مقصد و بے افادیت ہلاک کرنے سے عام طور پر لوگ ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں، کیوں کہ یہ ہلاکت اصل انسانی فطرت اور فطری جذبۂ رحم کے برعکس ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جان داروں کو مارنے کا کام بھی ہمیشہ جاری رہا ہے۔ یہ نوع انسانی کی ضرورت رہی ہے۔ اس کے عوامل مثبت بھی رہے ہیں، جیسے غذا، دوا اور مختلف اشیائے استعمال کی تیاری و فراہمی، اور منفی بھی رہے ہیں، جیسے نقصانات، خطروں اور بیماریوں سے حفاظت۔

جانوروں، پرندوں، مچھلیوں وغیرہ کو غذا کے لیے بھی ہلاک کیا جاتا رہا ہے، دوا سازی کے لیے بھی اور ان کے جسم کے تقریباً تمام اعضاء اور عناصر سے انسانوں کے استعمال کے ساز و سامان بنانے کے لیے بھی۔ بہت سے جانوروں، کیڑوں مکوڑوں، مچھروں، سانپ، بچھوؤں وغیرہ کو مار ڈالنا اور جسم و صحت کے لیے مضر جراثیم کو ان کے نقصانات سے بچنے کے لیے ہلاک کیا جانا ہمیشہ سے رائج رہا ہے۔ موجودہ دور میں علوم و سائنس کی ترقی کے وسیع اور عام ماحول میں دوا سازی میں تحقیق و تجربہ کے لیے اور سرجری کی تدریس و تربیت کے لیے بے شمار

جانوروں، پرندوں، کیڑوں مکوڑوں، جراثیم وغیرہ کو ہلاک کیا جاتا ہے۔ٹھیک یہی حال نباتات کی ہلاکت کا بھی ہے۔جان دار پودوں اور درختوں کو کاٹ کر (یعنی ان کی 'ہتیا' کر کے) غلہ، ترکاری، پھل پھول وغیرہ چیزیں غذا، دوا اور بے شمار کارآمد چیزیں تیار کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ان تمام ہلاکتوں میں سے کوئی بھی ہلاکت آج تک کبھی بھی تشدد، بے رحمی اور سنگ دلی میں شامل نہیں کی گئی۔اسے جذبۂ رحم کے خلاف اور برعکس نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔کچھ برائے نام استثناء کو چھوڑ کر عام طور پر معاشرہ، گروہ یا مذہبی فرقہ، قوم، تہذیب، تمدن وغیرہ کسی بھی سطح پر جانوروں کو ہلاک کرنے کی مندرجہ بالا صورتوں اور رواجوں کی تردید اور مخالفت نہیں کی گئی۔ بڑے بڑے مذاہب اور ان کے پیروکاروں میں 'جیو ہتیا' کے حوالے سے انسانی رحم دلی، اور اللہ کے رحیم اور رحمٰن ہونے پر معترضانہ سوال نہیں اٹھائے گئے۔

ہندوستانی روایات میں جانوروں کا ذبیحہ اور گوشت خوری

اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر اور مسلم موقف کا تذکرہ کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہندوستانی روایات پر (ناقدانہ اور منفی نظر نہیں) ایک سرسری معروضی نگاہ بھی ڈال لی جائے۔اس کے لیے سناتن (ہندو) دھرم کی کتابِ شریعت 'منوسمرتی' ایک مناسب ماخذ ہے۔

☆ منوسمرتی کو ہندو دھرم کی بہت اہم مذہبی کتاب (شاستر) ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔اس کے صرف ایک (پانچویں) باب میں ۲۱/اشلوکوں میں گوشت خوری سے متعلق تعلیمات، اصول اور احکام بیان کیے گئے ہیں۔رندھیر پرکاشن، ہری دوار سے شائع، جس کے مترجم پنڈت جوالا پرساد چترویدی ہیں، نسخے (چھٹی طباعت، ۲۰۰۲ء) میں :5:21-22، 5:17-18، 5:35-36، 5:31-32، 5:29-30، 5:27-28، 5:23، 5:56، 5:43-44، 5:41، 5:39، 5:37-38 میں یہ باتیں دیکھی جاسکتی ہیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) برہما نے گوشت کو انسانی زندگی کے لیے غذا تسلیم کیا ہے۔غلہ، پھل، چرند پرند وغیرہ انسانوں کی ہی غذائیں ہیں۔برہما نے ہی غذائی اشیاء اور انھیں کھانے والوں، دونوں کی تخلیق کی ہے۔خود برہما نے یگیوں کے لیے جانور بنائے ہیں، اس لیے یگیہ میں جانوروں کو ہلاک کرنا ہنسا اور تشدد نہیں ہے۔

(۲) گوشت خوری کے لیے کچھ جانوروں کے نام بتائے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ سناتن

طریقے کو مانتے ہوئے سنسکار کے ذریعہ پاک اور خالص کیے گئے جانوروں کا ہی گوشت کھانا چاہیے۔

(۳) وید میں بتائے گئے اور اس متحرک دنیا میں متعین تشدد کو عدم تشدد ہی سمجھنا چاہیے، کیوں کہ مذہب وید سے ہی نکلا ہے۔

(۴) اگستیہ مُنی کی اطاعت میں برہمن یگیہ کے مطابق یگیہ یا انسانی زندگی کے تحفظ کے لیے جانوروں اور پرندوں کو ذبح کیا جاسکتا ہے۔ منوجی کے مطابق مدھو پرک، جیوتشٹو مادی یگیہ پرت کرم اور دیو کرم میں جانوروں کو ذبح کرنا چاہیے (شرادھ اور مدھو پرک میں) اور وِدھی نیکتا ہونے پر گوشت نہ کھانے والا شخص مرنے کے ۲۱ رجنم تک جانور ہوتا ہے۔

(۵) دیوتاؤں کی خوش نودی کے مقصد کے بغیر بلا وجہ جانوروں کو مارنے والا شخص ان جانوروں کے بالوں کے برابر جنم جنم مارا جاتا ہے۔

مہابھارت انوشاسن، باب ۸۸ میں پتامہ بھیشم اور دھرم راج یدھشٹر کے درمیان گفتگو کے مطابق:

> ''...شرادھ (آباء کی سکھ شانتی کے اہتمام) کے وقت مچھلی کا تحفہ (اُپہار) دو مہینہ تک، بھیڑ کا گوشت تین مہینہ تک، خرگوش کا گوشت چار مہینہ تک، بکری کا گوشت پانچ مہینہ تک، سور کا گوشت چھ مہینے تک، پرندوں کا گوشت سات مہینے تک، پرشٹھا ہرن کا گوشت آٹھ مہینے تک، رودو ہرن کا گوشت نو مہینے تک، کوے کا گوشت دس مہینے تک، بھینس کا گوشت گیارہ مہینے تک، گائے کا گوشت ایک سال تک، بڑے بیل بدھرینا کا گوشت بارہ سال تک اور قمری سال کے مطابق آباء کی موت کے سال پر بطور نیاز چڑھائے جانے والے گینڈے کا گوشت ہمیشہ کے لیے انھیں آرام وراحت میں رکھتا ہے۔ ان کے لامتناہی آرام وراحت کے لیے لال بکری کے گوشت کا ہی چڑھاوا دیا جانا چاہیے۔'' (تلخیص)

ایسی ہی تعلیم منوسمرتی 3:268,69,70,71 میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

(۱) غذا کے طور پر گوشت کھایا جاسکتا ہے۔

(۲) یگیہ کے لیے، شرادھ کے لیے اور دیو کرم میں جانوروں کو ہلاک کرنا چاہیے، یہ عدمِ تشدد ہے۔

(۳) جانوروں کا خدا کے ذریعہ متعین اور بتائے گئے طریقوں اور مقاصد کے بغیر ذبح کرنا گناہ ہے۔

(۴) چرند پرند اور پیڑ پودے انسان کی غذا کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ (بودھ کے دور میں اہنسا کی تحریک کے وقت اور اس کے پہلے) ویدک

سناتن مذہب میں گوشت خوری اور یگیوں کے لیے جانوروں کو ہلاک کرنے کا رواج تھا۔ مذہب اس کا مخالف نہیں، بلکہ حامی اور داعی تھا۔

اسلام کا موقف

منوسمرتی، وید، مہابھارت، سناتن طریقہ اور ویدک دور کے مندرجہ بالا حوالوں سے گوشت خوری، جانوروں کو ہلاک کرنا اور قربانی، اسلامی موقف کی تصدیق میں دلیل کے طور پر پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ اسلام ایک فطری اور آفاقی مذہب کی صورت میں اپنے آپ میں مکمل، مدلل اور معتبر ہے۔ مندرجہ بالا باتیں موضوع کو سمجھنے کے لیے اُن برادران وطن کی آسانی کی خاطر لکھی گئی ہیں، جو اسلام میں انگلی اٹھاتے وقت دھیان نہیں رکھ پاتے کہ وہ اس اعتراض کے ساتھ ہی بالواسطہ طور پر ایک طرف تو ایک مذہبی سچائی کا انکار بھی کر رہے ہیں اور دوسری طرف خود اپنے (سناتن ہندو) مذہب کی کتابوں اور ان میں مذکور تعلیمات وعقائد پر اعتراض بھی۔

اسلام کا نظریہ اس موضوع پر مختصراً یہ ہے:

☆ کرۂ ارض کے بحر و بر کی ساری (جان دار، نباتات اور جمادات) اشیاء انسانوں کی خدمت یا غذا کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

☆ کسی بھی جان دار کو بے کار اور بے مقصد ہلاک کرنا جائز نہیں ہے، صرف بوقتِ ضرورت اسے مارنے کی اجازت ہے۔

مسلم موقف

قربانی اللہ کی راہ میں حسبِ موقع و تقاضا اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے جذبے کی عملی علامت ہے۔ اس کا آغاز تقریباً چار ہزار سال قبل ہوا، جب اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ سے اللہ نے اپنے لیے ان کے جذبۂ خود سپردگی و اطاعت گزاری اور محبت کا امتحان لینے کے لیے حکم دیا تھا کہ اپنی عزیز ترین شے، بڑھاپے کی اولاد اسماعیلؑ کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیں۔ ابراہیمؑ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری پھیرنے کو تھے کہ اللہ کی طرف سے صدا آئی کہ بس تم کام یاب ہو گئے۔ بیٹے کی قربانی مطلوب نہیں تھی (لہٰذا بیٹے کی قربانی کے فدیہ میں) ایک دنبے (بھیڑ) کی قربانی دیں، یہی کافی ہے۔ (قرآن، ۳۷:۱۰۱-۱۰۷)۔ اس وقت سے آج تک اس تاریخ (۱۰/ذی الحجہ) کو، جانور کی قربانی دے کر مسلم معاشرے کے (قربانی کی استطاعت رکھنے والے) تمام افراد

علامتی طور پر اللہ سے اپنے تعلق، وفاداری اور اس اعتماد و ارادے کو ہر سال تازہ کرتے ہیں کہ ''اے خدا! تیرا حکم ہوگا، ضرورت ہوگی، تقاضا ہوگا تو ہم تیرے لیے اپنی ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہیں۔ دراصل یہی اللہ سے محبت کا کمال، اور اس کے احکام کی پابندی کی معراج ہے۔

مسلمانوں کی متشدد 'فطرت' (؟)

الزام یہ ہے کہ جانور ذبح کرنے اور گوشت کھانے کا اثر ہے جس نے مسلمانوں کو متشدد (Violent) بنا دیا ہے، لیکن یہ الزام چار اعتبارات سے غلط ثابت ہوتا ہے:

اول: جو لوگ صرف سبزی خور (Vegetarians) ہیں۔ وہ اکثر گوشت خوروں سے زیادہ متشدد اور ہنسک واقع ہوئے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کی حالیہ تاریخ اور خصوصاً میانمار (برما) کے واقعات پر نظر ڈالیے۔ اہنسا کی سب سے بڑی پجاری اور عدم تشدد کی مبلغ اور دعوے دار ایک قوم نے 'ہنسا' کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

دوم: یہ الزام لگانے والے خود، مسلمانوں سے زیادہ گوشت کھاتے ہیں، خواہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے جانور ذبح نہ کرتے ہوں۔

سوم: یہ الزام اُس قوم پر نہیں لگایا جاتا جو جانوروں کو ذبح کر کے تو نہیں، اس کی گردن جھٹک کر پھر اس کا جسم کاٹتی اور گوشت کھاتی ہے۔

چہارم: تاریخ کے اوراق کھنگالیے یا حالیہ برسوں کے واقعات دیکھیے (اور اس دوران اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالم گیر میڈیائی نظام کی پروپیگنڈا مہم سے متاثر نہ ہوئیے) تو آپ دیکھیں گے کہ لاکھوں انسانوں کی ہلاکت، قتلِ عام اور نسل کشی (Genocide) کا 'سہرا' مسلمانوں کے سر پر نہیں، بلکہ عدم تشدد کے علم برداروں کے سر پر بندھا ہوا ہے۔ انفرادی یا چھوٹے موٹے گروہوں کی سطح پر، اگر مسلمان متشدد ہوئے بھی ہیں تو اسلام کی تعلیمات کے خلاف جا کر، ورنہ بحیثیت مجموعی مسلم امت، انسانوں کے معاملے میں درندہ صفت کبھی واقع نہیں ہوئی، کیوں کہ اس کا اجتماعی ضمیر قرآن وسنت کے ذریعے کنٹرول ہوتا ہے اور یہ یقین اس کے خمیر میں گندھا ہوا ہے کہ انسانوں کی جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اور ہر مسلمان کو آخرت میں، اپنے دنیوی افعال و اعمال کی جواب دہی (اور اسی مناسبت سے جزا یا سزا) کے مرحلے سے گزرنا ہے۔

ꕥ

باب:۱۱

کعبہ: 'بت پرستی' کی علامت؟

''اسلام خود کو بت پرستی کا مخالف مذہب کہتا ہے، لیکن مسلمان نماز ادا کرتے وقت کعبہ کی جانب رخ کرتے ہیں! کعبہ میں نصب حجرِ اسود کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ بت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ بت پرست لوگ بھی تو بتوں کو سامنے رکھ کر، درحقیقت اللہ کی ہی عبادت کرتے ہیں۔''

تمہید

یہ ایک عجیب بات ہے کہ ایشور کو ہی اصل معبود اور سب سے بڑی ہستی ماننے کے باوجود ہندوستان کی مذہبی روایات میں ایشور کا کوئی مندر نہیں ہوتا، جس میں ایشور (خدا) کی پرستش یا عبادت ہوتی ہو۔ یہاں ایشور کو نظر انداز کر کے دیوتاؤں، دیویوں اور اوتاروں کے نام سے مندر قائم ہیں، جن میں ان کی مورتیوں کو سامنے رکھ کر پوجا کی جاتی ہے۔ ''مورتی پوجا کی صورت میں ایشور پوجا'' میں یہ شرک (جو خود ویدک تعلیمات سے بھی ٹکراتا ہے) کچھ برادرانِ وطن میں یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ مسلمان بھی کعبہ اور حجرِ اسود کے 'بت' کی پرستش کرتے ہیں۔

اسلام کے خالص عقیدۂ توحید میں صرف اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ اللہ کا نہ تو کوئی اوتار ہے نہ دیوی دیوتا کی شبیہ میں اس کی کوئی شکل وصورت اور مجسمہ۔ یہاں مساجد میں غیر مجسم اللہ کی ہی عبادت ہوتی ہے۔ کعبہ کی جانب صرف رخ کیا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں مسلمان نماز پڑھنے کے لیے خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرتے ہیں، تاکہ یکسوئی اور یکسانیت مستقل طور پر متعین اور یقینی بنی رہے۔ کعبہ کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ کسی دیوی دیوتا یا اوتار کا مجسمہ ہے نہ یہ اللہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اپنے وجود میں یہ پتھروں کا ایک چوکور ڈھانچہ ہے، جس میں دیواریں ہیں، چھت ہے، دروازہ ہے اور اپنے معنوی وجود میں یہ مرکزِ توحید ہے۔

کعبہ اور حجرِ اسود

کعبہ کی ایک دیوار پر ایک کالا پتھر لگا ہوا ہے۔ اس کو اسلام کے پیغمبرؐ نے بوسہ دیا تھا (اس کی پوجا نہیں کی تھی)۔ بوسہ دینے کے اس عمل میں عبدیت/معبودیت کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ پیغمبرؐ کی پیروی میں آپؐ کے امتی بھی اسے بوسہ دینے لگے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ پیغمبرؐ کے وقت میں کسی کے ذہن و دل میں یہ خیال ذرہ برابر بھی نہ تھا کہ اس پتھر میں کوئی خدائی صفت یا قوت ہے اور یہ کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے، یا یہ اللہ کا نمائندہ، علامت یا شریک ہے، اس لیے بطور عبادت اسے بوسہ دیا جائے۔ یہی کیفیت آج تک برقرار ہے اور مستقبل میں بھی برقرار رہے گی۔

اللہ کے رسول حضرت محمدؐ کی رحلت کے بعد دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ (دورِ حکومت ۶۳۴-۶۴۵ء) نے اس خیال سے کہ کہیں آگے چل کر لوگ جہالت میں یا جذباتی ہو کر اس کالے پتھر کو پتھر سے کچھ زیادہ نہ سمجھنے لگیں، ایک موقع پر عوام کے درمیان پتھر کے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا کہ تو ایک پتھر ہے، صرف پتھر! ہم تجھے صرف اس وجہ سے بوسہ دیتے ہیں کہ ہم نے حضرت محمد ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے زیادہ تیری کوئی اور حیثیت و اہمیت ہمارے نزدیک نہیں ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ تو ایک بے جان شے ہے، ہمیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ (قابلِ پرستش اور معبود ہونا تو بعید از امکان ہے۔)

کعبہ اور حجرِ اسود کی تاریخ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کعبہ اور حجرِ اسود ہے کیا؟ اور ان کی اسلام میں اہمیت کیا ہے؟ جواب کے لیے اختصار کے ساتھ ان کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ تقریباً چار ہزار سال قبل اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا کہ اس مقام پر ایک گھر بنائیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر پتھروں کا ایک گھر بنالیا۔ اللہ نے اسے اپنا گھر (بیت اللہ) کہا اور حکم دیا کہ یہاں میری عبادت کے لیے نماز پڑھو اور اس کا طواف (Circumbulation) کرو۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ کعبہ کا گھر نہ تو خدائے لامکان کی جائے قیام تھا اور نہ اس کا مادّی مظہر اور علامت کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا یا اس کا طواف کرنا کعبہ کی پرستش مانا جاتا، بلکہ وہ توحید کی علامت تھا۔ اللہ نے دنیا کے مسلمانوں کو توحید کے اس مرکز سے جوڑ کر انھیں توحید پر یکسو، مجتمع اور اکٹھا کرنے کا اہتمام کیا اور اس کے طواف کو اس بات کی علامت قرار دیا کہ ان کی

انفرادی اور اجتماعی زندگی توحید کے محور پر اسی کی چہار جانب گردش کرے گی، یعنی God-centric ہو کر منظّم رہے گی۔

تقریباً ڈھائی ہزار سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا، لیکن جہالت کی تاریکی آئی تو کعبہ میں مورتیاں رکھ دی گئیں اور مرکزِ توحید، مرکزِ شرک بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رسالت کے ۲۱ رویں سال اسے مورتیوں سے پاک کر دیا اور اس کے مرکزِ توحید ہونے کی حیثیت کو بحال (Restore) کر دیا۔ یہ صورتِ حال ڈیڑھ ہزار سال سے قائم ہے۔ مکہ شہر میں دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمان عام دنوں میں روزانہ اور حج کے دنوں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ کعبہ کا طواف کرتے ہیں، اس کی جانب رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں اسی جانب رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ خانۂ کعبہ کے رخ پر دنیا بھر کی مساجد تعمیر کی جاتی ہیں۔ ان مساجد میں نہ کعبہ کا کوئی بت ہوتا ہے نہ خدا کا۔ ان میں نماز پڑھتے وقت ذہن صرف خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے نہ کہ کعبہ کی طرف۔ یہی کیفیت ہر شخص کی، ہر اس نماز میں بھی ہوتی ہے جو مسجد میں ادا نہ کی جاتی ہو۔

تاریخ کے کسی مرحلے میں باشندگانِ مکہ کو شہر کے آس پاس کہیں ایک کالا چمک دار پتھر ملا۔ ایسے پتھر اس علاقے کے پہاڑوں میں کہیں بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ جنت سے نیچے آیا ہے (ممکن ہے کہ وہ کسی شہاب ثاقب (Meteorite) کا ٹکڑا رہا ہو) لوگوں نے اسے مبارک اور پاکیزہ سمجھ کر کعبہ کی ایک دیوار میں لگا دیا اور اسے بوسہ دینے لگے۔ اس وقت سے حضرت محمدؐ کے وقت تک بت پرستوں اور مشرکوں نے بھی اس پتھر کی پرستش کبھی نہیں کی تھی۔

پیغمبرِ اسلام کی بعثت ہوئی اور اسلام کی دعوت از سرِ نو دی جانے لگی تو اس کے ساتھ بت پرستی اور شرک کی تردید بھی کی جانے لگی۔ حجرِ اسود کی پرستش کا رواج نہیں تھا، لوگ اسے صرف بوسہ دیتے تھے۔ اس لیے حضرت محمد ﷺ نے لوگوں کے جذبات کو بلاوجہ مجروح کرنا مناسب یا ضروری نہیں سمجھا، بلکہ عام رواج کے مطابق آپؐ بھی اسے چوم لیا کرتے تھے۔ آپؐ کی تقلید میں مسلمان حجرِ اسود کو ڈیڑھ ہزار سال سے آج تک چومتے آ رہے ہیں۔ اس عقیدے اور یقین کے ساتھ کہ یہ محض ایک پتھر ہے، اس میں کوئی خدائی قوت یا صفت نہیں ہے۔ یہ کسی کو نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔

ꕥ

باب: ۱۲

اذان اور شہنشاہِ اکبر

''مسلمان روزانہ پانچ بار مسجدوں سے اونچی آواز میں اکبر بادشاہ کو کیوں پکارتے ہیں؟ کیا اس لیے کہ وہ ماضی کی اپنی حکومت کو واپس لانے کے خواہش مند ہیں؟''

یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے، جو اذان میں بولے جانے والے لفظ 'اکبر' کا معنی نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ لفظ روزانہ پانچ اوقات میں کئی بار مسجدوں سے اونچی آواز میں سنا جاتا ہے۔ اسلام میں فرض نمازوں کا اجتماعی طور پر ادا کیا جانا مطلوب اور بہتر ہے، بلکہ اگر حالات بالکل ہی ناسازگار نہ ہوں تو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس اجتماعیت کے لیے دو باتوں کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ متعین مقام اور لوگوں کو یکجا کرنے کا طریقہ۔ پہلی ضرورت کے لیے مسلم معاشرے میں مسجد بنانے کا رواج فروغ پایا اور اسے ایک لازمی اور انتہائی ثواب کا کام قرار دیا گیا۔ دوسری ضرورت کے لیے اسلام کے بالکل ابتدائی دنوں میں حضرت محمد ﷺ کی منظوری و اجازت سے اذان کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ 'اذان' عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی پکار کر بتانا یا اعلان کرنا ہے۔

اذان کے ذریعہ آواز دے کر لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، سب لوگ عبادت گاہ میں آجائیں، جو مسجد بھی ہو سکتی ہے اور دوسری کوئی جگہ بھی۔ عربی کے لفظ 'اکبر' کا معنی ہے 'بڑا'۔ یہ اسلامی اصطلاح میں اللہ کا صفاتی نام ہے۔ اس اصطلاح میں 'اکبر' کا معنی ہوتا ہے 'بڑا'، 'سب سے بڑا'۔ اذان کے اولین بول ہیں: ''اللہ اکبر'' یعنی اللہ بہت بڑا ہے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں میں جتنی بھی بڑائیاں پائی جاتی ہیں وہ اللہ کی دی ہوئی ہیں اور اس کی عظمت و بڑائی سے بہت چھوٹی، حقیر، نامکمل، غیر مستقل اور ناقص ہیں۔ حقیقت میں 'بڑا' صرف اللہ ہی ہے۔

اذان گرچہ اجتماعی عبادت کے لیے بلاوا ہے، پھر بھی اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی پوشیدہ ہے کہ خالص توحید کی مسلسل یاددہانی اور اس کا اعلانِ عام ہوتا رہے۔ اذان میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے بھی روز بروز اعلان کے ساتھ یہ ایمان اور یقین تازہ ہوتا رہے کہ کوئی

مسلمان (اور پورا مسلم معاشرہ) اپنی مرضی کا ہر اُلٹا سیدھا طرزِ زندگی اپنانے کو آزاد نہ رہے۔ بلکہ حضرت محمد ﷺ کے اُسوہ کے مطابق ایک حق پسند، نیک، اور خدا ترس زندگی بسر کرنے کی یاد دہانی بھی اسے مسلسل ہوتی رہے اور اس کے لیے حوصلہ وعزم بھی تازہ ہوتا رہے۔

شہنشاہِ اکبر کی تاریخ صرف چار سو سال پرانی ہے، جب کہ اذان کے یہ کلمات ۱۴۳۵ سال پرانے ہیں۔ ہندوستان میں ہی نہیں (جہاں بادشاہ اکبر گزرا)، پوری دنیا میں نمازیوں کو مسجد میں بلانے کے لیے، تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے مسلسل یہ آواز لگائی جاتی ہے۔ یہ آواز کسی بھی وقت نہیں، بلکہ شریعت کے مطابق صرف اسی وقت لگائی جاسکتی ہے جب نماز کا مقررہ وقت ہو جائے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں اور (یورپ کے ایک ملک میں بھی) کچھ لوگ اذان کی آواز پر سخت اعتراض کرتے ہیں۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اعتراض کرنے والے بھائیوں میں سے زیادہ تر، معلومات کی کمی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اذان کے الفاظ کے معنی نہیں جانتے، نہ اذان کے مقصد سے واقف ہیں۔ اذان کے کلمات کے معانی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کلمے نہ کسی قوم کے حق میں بولے جاتے ہیں، نہ کسی قوم کی مخالفت میں۔ یہ آواز ہر وقت نہیں لگائی جاتی اور جب لگائی جاتی ہے اس وقت صرف تین چار منٹ سے زیادہ کے لیے نہیں۔ یہ اس اللہ کی کبریائی اور وحدانیت کا اعلان ہوتا ہے جو تمام کائنات کا خالق، مالک اور رب حقیقی ہے۔ اس میں اللہ کے اس پیغمبر کا نام بھی آتا ہے، جو تمام نوعِ انسانی کے خیر خواہ تھے۔ یہ آواز کسی کو تکلیف دینے کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کی عبادت کی خاطر جمع ہونے کے لیے لگائی جاتی ہے۔

ہاں، مسلمانوں پر یہ اخلاقی وسماجی ذمہ داری ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی آواز کا والیوم (Volume)، خصوصاً جب مسجد ملی جلی آبادی میں ہو، عین ضرورت کی حد تک کنٹرول کیا جائے۔ آواز غیر ضروری طور پر اتنی اونچی اور کرخت نہ ہو کہ غیر مسلم بھائیوں بہنوں کو خواہ مخواہ اس سے تکلیف پہنچے۔ مسلم سماج کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ ملی جلی آبادی میں اگر اذان پر اعتراضات اٹھے تو امن پسندی وسلیقہ مندی سے برادرانِ وطن سے بات کی جائے اور باہم تناؤ یا تنازعہ پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ اذان کے کلمات کے معانی اگر برادرانِ وطن کو سمجھا دیے جائیں اور اذان لاؤڈ اسپیکر سے دینے میں مندرجہ بالا احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو پوری امید ہے کہ اذان پر اعتراض ختم ہو جائے گا اور تنازع وجھگڑے کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔

ꕥ

باب: ۱۳

صرف اسلام ہی سچا مذہب کیوں؟

''سارے دھرم خدا سے نکلے ہیں اور خدا ہی ان کی منزل ہے۔ اسلام بھی سچا مذہب ہے، لیکن بات اس وقت بگڑ جاتی ہے جب یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ صرف اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ صرف اسلام کو سچا مذہب قرار دینا ہی سارے فساد، عداوت اور ٹکراؤ کی جڑ ہے۔''

تمہید

وہ خدا بھلا کیسا خدا ہوگا جو سب کا ہو، سب کے لیے رحیم ہو، لیکن لوگوں، گروہوں اور قوموں کو الگ الگ، متضاد مذاہب دے کر ایک دوسرے سے ٹکراتے رہنے کا مستقل انتظام بھی کر دے۔ پس یقیناً بہت سے مذاہب بنا دینا حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔

مذاہب کی حقیقت

لیکن اس خدائی حکمت کے خلاف، جب اس کا 'ایک' دھرم 'کئی' دھرموں میں توڑ کر رکھ دیا گیا تو منطقی طور پر دھرموں میں یہ اتفاق اور یکسوئی بھی نہیں رہ گئی کہ ان کے 'خدا سے نکلنے' کا حقیقی مطلب کیا ہے اور اس کے مطابق انسانی زندگی کی صورت گری، تنظیم اور تربیت کس طرح ہوگی؟ دھرموں میں اس بات پر بھی بڑا اختلاف اور کنفیوژن ہے کہ 'خدا ہی ان کی آخری منزل ہے' سے مراد کیا ہے؟ اس منزل کی حقیقی پہچان اور حتمی پتہ کیا ہے؟ اور اس تک پہنچنا یقینی بنانے والا راستہ کیا ہے؟ اور وہ راستہ انسانی زندگی کی کن کن راہوں اور پگڈنڈیوں سے گزرتا ہے؟ ایسے الجھاؤ اور غیر یقینی کے عالم میں رہتے ہوئے دینِ حق جیسی عظیم سچائی کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا اور اس پر جم جانا خود 'دینِ حق' کے معاملے میں نہایت درجہ غیر سنجیدگی اور لاپروائی کا معاملہ ہے۔

اسلام کا موقف

اسلام کا موقف سادہ، صاف، غیر پیچیدہ، قابلِ فہم، شفاف اور عقلِ عام کو اپیل کرنے والا ہے، وہ یہ کہ سچا دھرم (دینِ حق) صرف ایک ہی ہے، کیوں کہ سارے انسان، جن کے لیے خدا

نے دھرم بنایا، اسی خدا کی مخلوق ہیں۔ اسی نے سارے انسانوں کی منزل بھی طے کر دی ہے۔ اپنی کتابوں نیز اپنے رسولوں کے وسیلے سے اس منزل کی ٹھیک ٹھیک پہچان بھی کرا دی، اس کا پتہ بھی بتا دیا اور اس تک پہنچنے کے طریقے (اعمال و تدابیر) اور راستہ بھی بتا دیا ہے۔ ان پہلوؤں سے جانچنے کے بعد یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ سچا دھرم صرف ایک ہی ہے۔ اگر انسان طرح طرح کی عصبیتوں سے آزاد اور خود ساختہ نظریوں و فلسفوں سے خالی الذہن ہو کر تلاشِ حق اور اعترافِ حق میں مخلص ہو جائے تو اسے اس یقین کی دولت میسر آ جائے گی کہ وہ 'واحد سچا دھرم' اسلام ہے اور پھر اسے مذہب کے بارے میں لاحق تمام الجھنوں سے نجات مل جائے گی۔

اسلام کا موقف ہے کہ کچھ دھرموں میں (نہ کہ سبھوں میں) ابدی سچائی کے کچھ اجزاء تو یقیناً ہیں، لیکن ان میں انسانوں کی غفلت یا دخل اندازی یا دیگر اسباب نے تاریخ کے لمبے سفر کے دوران اتنی ردّ و بدل، ترمیم و تنسیخ اور حذف و اضافہ کر دیا ہے کہ ان کا باقی ماندہ بیشتر حصہ دھندلا، غیر شفاف، مشکوک اور غیر یقینی ہو گیا ہے۔ ان منفی عوامل و اسباب نے ان کے 'دینِ حق' ہونے کے وصف کو مشتبہ ہی نہیں، ساقط بھی کر دیا ہے۔ لہٰذا اسلام کا واضح اور دوٹوک موقف ہے — اور عالم انسانیت کو یہ پیغام بھی — کہ چوں کہ 'دھرم' کے بجائے 'دھرموں' کا اور ان میں بنیادی نوعیت کے فرق و اختلافات کا خالق خدا نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی عقل اور انسانی ہاتھوں کی تخلیق ہیں، لہٰذا خدائی منصوبۂ تخلیق (Divine Creation-plan) میں یہ انسانی دخل اندازی اور بے جا تصرف، اقوامِ عالم میں دوری، غیریت، اجنبیت، نفرت، عداوت اور ٹکراؤ کا اصل سبب ہے۔ لہٰذا اسلام کی یہ آفاقی و عالمی دعوت ہے کہ اس کیفیت کو ختم کرو۔ ایک سچے دھرم پر مجتمع و یکسو ہو جاؤ، پھر دیکھو کہ ہزاروں جھگڑے، لاکھوں عداوتیں، ٹکراؤ اور فساد کس طرح خود بخود ختم ہو جاتے ہیں اور چند لوگ ہی نہیں، پوری انسانیت ایک سیدھے سچے راستے پر اتفاق و اتحاد کے ساتھ، امن و سلامتی اور محبت و اپنائیت کے ساتھ اور باہم تعاون، ہمدردی و غم گساری کے ساتھ چلتے ہوئے اس منزل پر بخیر و خوبی پہنچ جائے گی، جسے تم 'خدا' کی منزل کہتے ہو۔

صحیح مذہب کو پرکھنے کے لیے کسوٹیاں

اسلام کے اس اعلان، دعوت، پیغام اور دعوے کو کہ 'صرف وہی سچا مذہب ہے' پرکھنے کے لیے کچھ مزید کسوٹیاں مقرر کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً:

(۱) مذہب کا بانی اللہ ہو نہ کہ کوئی انسان

مذہب کا منبع ومخرج خدا ہے تو اسی کو مذہب کا بانی (Founder) بھی ہونا چاہیے، نہ کہ کسی انسان کو، خواہ وہ کتنا ہی عظیم، محترم اور باکردار ہو۔ کیوں کہ دھرتی کے سینے اور آکاش کی آنکھوں نے آج تک کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو بشری کمزوریوں، ذاتی خواہشات ورجحانات، شخصی ذوق وپسند اور ہر قسم کے حالات اور ہر معاملے میں درست اور نادرست کے درمیان بے چوک (Absolute and Perfect) فیصلہ کرنے میں غلطی کا امکان نہ رکھتا ہو۔ اگر ایسا انسان خود مذہب کا بانی ہوگا تو مذہب کی تشکیل میں اس کی مذکورہ فطری کمزوریوں کا عمل دخل ضرور ہوگا، جیسا کہ متعدد ومختلف شخصی مذاہب اس کا ثبوت بھی دیتے آئے ہیں۔ وہ مذہب اپنے بانی کے قومی، نسلی یا وطنی مفادات سے بالاتر نہیں ہوگا، لہٰذا آفاقی (Universal) یعنی دنیا کے ہر انسان کے لیے قابلِ قبول بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ مذہب آفاقی سچائی ہونے کی کسوٹی پر کھرا نہیں اتر سکے گا۔ اگر کوئی مذہب سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے اس کسوٹی پر لازماً کھرا اترنا ہوگا۔

(۲) مذہب کا خطاب تمام انسانوں سے ہو

کوئی مذہب اگر سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے تمام انسانوں کو مخاطب کرنا چاہیے، کیوں کہ سچائی سارے انسانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ اس کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔ قومیں اور نسلیں تو صرف شناخت اور پہچان کے لیے ہیں۔ ممالک اور دیش تو صرف جغرافیائی سیاسی (Geo-political) خطے اور علاقے ہیں، لیکن خدا تو سب کا ہے اور سب لوگ خدا کے ہیں۔ لہٰذا سچا دھرم وہی ہوسکتا ہے جو خدائی ہو اور سب کے لیے ہو، ملک، علاقے، راشٹر، دیش، زمانہ اور زبان وغیرہ میں محدود ومحصور نہ ہو۔

سچا اور ہر انسان کے لیے معیاری صرف وہی مذہب ہوسکتا ہے جو بغیر کسی تقسیم وتفریق کے، تمام انسانوں کی پوری زندگی کے لیے کارآمد اور مفید ہو، جو انسانی وجود کے روحانی، اخلاقی پہلو اور جسمانی ومادّی پہلو کے درمیان تفریق، تقسیم اور علاحدگی کی تعلیم نہ دیتا ہو۔ انسانی وجود کے 'کل' کو الگ الگ 'جز' میں توڑتا اور پھاڑتا نہ ہو۔ کوئی بھی مذہب جو انسانوں کو یہ آزادی اور اختیار دیتا ہو کہ پوجا پاٹ تو خدا کے لیے کرلیا کرو، لیکن زندگی کے بقیہ امور ومعاملات سے خدا کو نکال

باہر کرو، وہ سچا مذہب نہیں ہوسکتا۔ سچا مذہب تو صرف وہی ہوسکتا ہے جس کا منبع ومخرج بھی 'خدا' ہو اور منزل بھی 'خدا'۔ اور انسانی افکار واعمال پوری طرح صرف اسی کے ماتحت اور پابند ہوں۔

(۳) مذہب زندگی کے ہر لمحے کے لیے ہو

صرف وہی مذہب سچے مذہب کی حیثیت میں انسانیت کا حقیقی مطلوب ومقصود ہوسکتا ہے جو کسی لمحہ، کسی وقت اور کسی بھی مرحلہ زندگی میں انسان کا ساتھ نہ چھوڑے۔ اسے بے سہارا، اور خدا کی سرپرستی، ہدایت اور رحمت سے محروم کر کے حالات کی سختیوں اور لاینحل مسائل والجھنوں کے سپرد نہ کردے۔ ایسے حالات اور مرحلے انسان کی اپنی انفرادی زندگی میں بھی آتے ہیں، خانگی، خاندانی اور سماجی زندگی میں بھی اور اجتماعی وتمدنی (تہذیبی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی) زندگی میں بھی۔ اس سچائی کے ادراک، احساس اور اعتراف کے لیے روزمرہ کی انفرادی واجتماعی زندگی کے گوشے گوشے میں، چپے چپے پر درپیش ان مصیبتوں، مسئلوں، سانحوں اور بحرانوں کا تجربہ و مشاہدہ کافی ہے جو مسلسل ہماری انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات کی جڑیں کھوکھلی ہوجانے کا ثبوت مہیا کرتی رہی ہیں۔ ایسی کسمپرسی کی کیفیت میں اگر مذہب ہمارے کام نہیں آتا، ہماری دست گیری اور مدد نہیں کرتا، بلکہ اس کا خدا آکاش میں بیٹھا اپنے بندوں کی پریشانی وتباہی کا تماشا دیکھنے میں مشغول رہتا ہے تو وہ مذہب نہ سچا مذہب ہے، نہ تمام انسانوں کے لیے ہے، نہ خدائی مذہب ہے۔

اس سہ پہلو کسوٹی پر سارے دھرموں کو پرکھ کر دیکھنا چاہیے۔ مسلم یا غیر مسلم ہونے سے قطع نظر کر کے، کسی بھی عصبیت (Prejudice) سے خالی الذہن ہوکر، خالص معروضی (Objective) انداز میں۔ موجودہ دور نے، جو علم، تجزیہ اور تحقیق کی بلندیوں پر ہے، یہ کام پچھلے زمانوں کی بہ نسبت آج ہمارے لیے بہت ہی آسان بنادیا ہے۔ اس جانچ پرکھ کے اس مرحلے سے تمام مذاہب کو گزارنے کے بعد، ہزار ہا ہزار سعید روحیں مسلسل یہ ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے 'قبولِ حق' کر رہی ہیں کہ سچا مذہب تو صرف اسلام ہی ہے۔ حق واضح ہوکر سامنے آجائے تو حق پسندی کا تقاضا ہے کہ اسے قبول کرلیا جائے، نہ کہ اسے مشتبہ اور متروک بنادیا جائے۔

ꕥ